

یادوں کے کچے

صدیوں کی مسافت طے کر کے آئی ہوں۔ میرا انگ
انگ ٹھکن زدہ تھا۔ آنکھیں گویا رو کر کر تھک چکی
تھیں۔

میں بھلا کس کا گریبان پکڑتی، کسے مجرم ٹھہراتی۔
میری بات پر بھلا کس نے ایمان لانا تھا۔ میں ماما کو کچھ
بتاتی تو نہیں پائی تھی۔ بھلا بتاتی بھی کیا؟ یہ میرا اپنا ہی تو
فیصلہ تھا۔ ماما نے مجھے کس قدر سمجھایا تھا مگر میں اپنی
سادگی میں کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔

مجھے چہرے دھونے کا دعوا تو بھی نہیں رہا تھا مگر میں
حیران تھی کہ بعض لوگ کس طرح صورت بدل بدل
کر سامنے آتے ہیں۔ ہر دفعہ ان کا نیا چہرہ نظر آتا تھا۔

باہر چمکتی دھوپ کا راج تھا۔ گرم لو کے تھپیڑوں
نے گویا ہر شے کو جھٹکا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے کھڑکی
کے پردے ہٹا کر باہر دیکھا۔ یوں لگ رہا تھا گویا میرا دل
سینہ توڑ کر گرم اور جھلسا دینے والی زمین سے لپٹ لپٹ
کر نین کر رہا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ماما مجھے بہت سمجھاتی، بھجاتی رہی
تھیں۔ زندگی کے شیب و فراز، اتار چڑھاؤ۔ مگر میں
انہیں بھلا کیا بتاتی۔ میرا دل تو آتش کدہ بن چکا تھا۔ میں
مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم بنادی گئی تھی۔ میرے
لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا خود کشی کے برابر تھا۔
آج آنکھوں دن تھا اور مجھے لگتا تھا، گویا میں

مکمل ناول



ایسا چہرہ جو کسی بھی سالہ دل رکھنے والے کو دھوکے میں مبتلا کر سکتا تھا۔

میری سادگی میرے لیے ہمیشہ نقصان کا باعث بنی تھی مگر اس دفعہ تو میرے دل کا نقصان ہو گیا تھا، یوں لگتا تھا گویا کسی نے میرا دل فوج کر کسی پتھر کے نیچے رکھ کر پھینک دیا ہے۔

مجھے اس سے بے تحاشا محبت جو ہو گئی تھی اور میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کبھی اس طرح کسی اور کی جھوٹی داستان سن کر بدگمان ہو جائے گا۔ اس کی بدگمانی کے کھاؤ نے میرے دل میں نیزے اتار دیے تھے۔

مگر میرے ساتھ بھلا ہوا کیا تھا؟

ان دنوں میرے ستارے گردش میں تھے۔ نجانے کس منحوس گھڑی میں دوبارہ سے ڈیڑھ افون خود بخود ٹھیک ہو گیا تھا اور ممانک یہ منحوس خبر بغیر کسی دشواری کے پہنچ چکی تھی۔ سدا کی کھینچی فسادن اور ہلا کی کم طرف غائبیہ کے ہلکے پیٹ میں میرے یعنی ساجیہ مراد کے متعلق ”خبر“ بھلا کیسے ٹھہر سکتی تھی مہما کو نوں کھڑکا کر میری شان دار کامیابی کی اطلاع پہنچا دی تھی۔

”خالہ! ساسی میٹرک میں ہیٹ ٹرک مار چکی ہے۔ اس مرتبہ بھی سابقہ ریکارڈ قائم رکھا ہے محترمہ خیر سے صرف تین مضمون کلیئر کر چکی ہیں۔ باقی سب میں گول انڈا لگتا ہے پرچوں میں نہاری، جھلمبلی اور گلاب جاسن کی ترکیب لکھ کر آئی تھی۔“

فون تو بند ہو چکا تھا اور مہما جو تے سے میری دھنائی کرنے کے بعد صوفے پر بیٹھی ہاتھ رہی تھیں۔ غم دغصے سے ان کا سرخ و سفید چہرہ جھٹکا رہا تھا۔ سبز آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔ یونیورسٹی کی پوزیشن ہولڈر میری پیاری ماما کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔

”بے شرم! چلو بھاری میں ڈوب مو۔ انیس سال کی ہو چکی ہو۔ ابھی تک میٹرک میں انکی ہو۔

تمہارے ساتھ کی گریجویشن اور سٹریڈز کر کے دو بیچے بھی کھلا رہی ہیں۔“

”آپ کی تسستی کی وجہ سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ ورنہ اس وقت آپ بھی ناؤں چکی ہوتیں۔“ میں نے افسوس کے عالم میں مہما کو گزرتے وقت کا احساس دلانا چاہا تھا۔ مہما جلد کر دوسرا جوتا اتارنے لگیں۔

”سوری مہما!“ میں فوراً ”صوفے کی اوٹ میں کشن اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مہما میری بے حیائی کے اس عظیم مظاہرے کو ملاحظہ کرنے کے بعد نجانے کس سوچ میں گم ہو چکی تھیں۔

میری نظرس مہما کے خالی پیروں پر تھیں۔ سو میں اطمینان سے صوفے پر ڈھبے لگی۔ عام حالات میں وہ

جوتے کے ساتھ پھینٹ لگانا میرے کے خلاف سمجھتی تھیں۔ عام حالات میں تو محض مجھے گھوریوں سے ہی ڈراؤ دیا جاتا تھا۔ اور مہما کی گھوریوں کا اثر ہی اس قدر ہوتا تھا کہ میں فوراً ”ہی حواس بانستہ ہو جاتی۔ اگرچہ مہما کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ میری جوتے کے ساتھ دھنائی کریں مگر خیر سے ”معاملہ“ ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ بھی کہاں تک ضبط کرتیں۔

میٹرک میں مجھے تیسرا سال لگ چکا تھا۔ میری کلاس فیلوز اور کزنو غیو مجھ سے کیس آگے نکل چکی تھیں، مگر میں اپنے کند ذہن کو بھلا کہاں سے پالش کرائی اور پھر سائنس دانوں کی ”بکواس“ میرے دماغ میں ساتی ہی نہیں تھی۔ نجانے کتنے ہی ٹیوٹر میری نالائقی سے گھبرا کر دوسرے ہی دن بھاگ گئے تھے۔ مجھ جیسی کند ذہن، نالائق کو ٹیوٹر مقرر کے ساتھ بھلا دماغ کھانے کی ضرورت ہی کیا تھی، جسے طبیعات کے تعارف کی الف ب بھی نہیں آتی تھی۔

باقی مضامین میں بھی میری دلچسپی ایوں سی تھی۔ ریاضی کو دیکھ کر تو مجھ پر زلزلہ طاری ہو جاتا تھا۔ ابھی پچھلے دنوں ہی کوئی چار پانچ ماہ پہلے فزکس کی تیاری کرواتے ہوئے، میری جان سے پیاری غائبیہ نے اچانک میری ذہانت کو جانچنے اور جو کچھ پڑھایا تھا اس کا ٹیسٹ لینے کی غرض سے پوچھا۔

”ساجی! اس منٹ کے اندر اندر جواب دیتی جانا“ آج ہمیں پڑھا کر میں نے اسو کی طرف جانا ہے۔ وہ میرے لیے کانکا اور چیخوف کی کتابیں لے کر آیا ہے۔ اور میں وہ کتابیں پڑھنے کے لیے تخت بے چین ہو رہی ہوں۔“

غانی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ان فضول کتابوں کے نام لے کر گویا پوری پوری اور خطائی کا زائد لقمہ اس کے منہ میں گھل گیا تھا۔ میرے منہ کے زاویے اسو کا نام سن کر ہی بننے، بگڑنے لگے تھے۔ منہ میں گویا کروے بادام آگئے۔ حالانکہ یہ چاکلیشی ہیرو جیسا کرن فرینڈز کے درمیان گردن اگڑانے اور دوستوں کے درمیان ویلیو بنانے کا سبب تھا۔

”چھوٹو بھی غانی! جس رائٹر کا نام ہی اتنا خوف زدہ کر دینے والا ہو۔ اس کی تصنیف کتنی بکواس ہوگی۔ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا چیخوف۔ یعنی زرا خوف ہی خوف۔ اور یہ فرارز کا کڈا۔ ایسے لگتا ہے جیسے رازدار کاٹنے یعنی خورک کا ڈر کیا جا رہا ہے۔ غانی! مجھے تو بھوک بھی لگ گئی ہے۔“ میں نے بیٹ پکڑ کر دہائی دی تو غانی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب میرے سر پر دے ماری۔

”بھوسا بھرا ہوا ہے یہاں۔“ کتاب کے وزن سے میرے دماغ کی چولیس مل کر رہ گئی تھیں۔ اوپر سے غائبیہ کا موڈ بگڑ گیا تھا۔

”تمہیں ٹھیک ہی یاد رہن، دھون اور وزن کا خطاب دیا گیا ہے۔ تمہارا دماغ پڑھنے کی طرف نہیں مائل ہونے والا۔ پکڑے اور کھانے کے علاوہ کچھ نہیں سوچتا۔ کھا کھا کر ایک دن غبارے کی طرح پھٹ جاؤ گی۔ موتی!“ غانی میری اچھی صحت پر چوٹ کرنے سے باز نہیں آتی تھی اور کھانا پکانے کے طعنے دیتا تو مہما اور ان کی پیاری بھانجی غانی کا رویہ نہ مشغول تھا۔ میں نے تو اکثر ہی ہاؤس کو آپس بھرتے دیکھا ہے کہ ان کی بیٹیاں بچن کے نام سے ہی دور بھاگتی ہیں۔ سینے پر دے کا بھی کوئی شوق نہیں ہوتا۔ گھر کے کام کاج سے

الرجک ہوتی ہیں جبکہ مجھ میں سنگھڑ خواتین والے سارے جراثیم پائے جاتے تھے۔ مگر میرے ہاتھ میں جھاڑو دیکھ کر ممانک شتھا اٹھتی تھیں۔

”بھی اسی شوق اور جذبے سے کتاب بھی پکڑ لیا کرو۔“ یہ طعنہ تو مہما کی نوک زباں پر ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ نجانے مجھے مہما کیسی ماں تھیں۔ یعنی میں جو ایک سٹرا میڈ کی خدمات سر انجام دیتی تھی۔ ان کی ماما کے نزدیک اس کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔

”ساجیہ مراد! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ علم موسیقی اور آواز پر سائنسی دریافتیں کرنے والے سائنس دان کا نام بتاؤ جو کہ تیسری صدی ہجری میں بصرہ میں پیدا ہوا تھا۔“ مجھے سوچوں میں الجھا دیکھ کر غانی نے کافی ناراضی کے عالم میں اپنا سوال دہرایا۔

”تیسری صدی ہجری میں کون پیدا ہوا تھا؟“ میں نے یادداشت کے سارے خائے کھنگالنے شروع کر دیے تھے۔

”کون سی ایسی کھانے والی چیز کے نام سے ملتا جلتا نام تھا۔ علم موسیقی کو دریافت کرنے والے سائنس دان کا۔“ میں زیر لب بڑبڑاتے ہوئے سخت ٹینشن میں مبتلا ہو چکی تھی۔

”ساجی! غانی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا اور میرے منہ سے اچانک لقمہ برآمد ہوا۔ ”شکر قدی“ یعنی الکندی۔“

”بھانڈ میں جاؤ تم۔ ایک سوال کے جواب میں ندرہ منٹ پرلو کر دیے ہیں۔ پیپر میں نجانے تم کیا کرو گئی۔“ غانی درست جواب سن کر بھی منہ پھلائے بیٹھیں رہی۔

”سوری غانی!“ میں نے بھی غلطی تسلیم کر کے معافی مانگنے میں دیر نہیں کی تھی۔

”آخری جواب بتاؤ، پھر جان چھوٹ جائے گی تمہاری۔ ویسے بھی ”کمر“ لگنے والا ہے۔“ غانی میری دلی کیفیات سے واقف تھی۔ تب ہی تو میرے فیورٹ ڈرامے کا ڈر کیا تھا۔

”پوچھو“ میں نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔
 ”حالت سکون سے چلنے والی کار کی ابتدائی ولاشتی کتنی ہوتی ہے؟“
 ”یہ ولاشتی صفر ہوتی ہے۔“ میں نے بھی نظر بچا کر کتاب میں سے ایک کروڑ کھانچا اور جھٹ سے جواب بھی دے دیا تھا۔ غالی کون سامیری طرف متوجہ تھی۔ اپنا پنڈیک کھولے بل کا پیکٹ نکال رہی تھی۔ سو میرا بھی کام چل گیا اور آج ان ہی چھوٹی مٹی ”چوریوں“ کا خمیازہ قفل ہونے کی صورت میں بھگت رہی تھی۔
 ممانے کافی سوچ بچار کرنے کے بعد سراٹھا کر میری طرف دیکھا تھا اور پھر لوٹیں۔
 ”ساجہ! کتابیں سمیٹ کر نیچے آ جاؤ۔ میں تمہاری پیکنگ کرنے لگی ہوں۔“
 ”مگر کیوں ممانے؟ میں حیران پریشان ہی تو رہ گئی تھی۔
 ”تم نبیلہ کے پاس جا رہی ہو۔“ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔
 ”پھوپھو کے پاس مگر کیوں؟“ اپنی ہلڑ ٹائپ پھوپھو کے پاس جانے کے متعلق سوچ کر ہی میں گڑبڑا رہی تھی۔
 ”اس لیے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔“
 ”مما پلیز!“ میں منتناقی رہ گئی تھی۔
 ☆ ☆ ☆
 ”ڈیڈی! ممانے مجھے اسلام آباد بھجوانے لگی ہیں۔“
 ڈائمنگ روم میں گھسے ہی میں نے دہائی دیا شروع کر دی تھی۔ تاہم اسی یعنی بڑی ماما اور ڈیڈی (تایا ابو) آدھا گھنٹہ پہلے ہی گھر آئے تھے۔ دونوں عدا بھائی کے بیٹے کو دیکھنے کراچی گئے ہوئے تھے۔ عدا بھائی ڈیڈی کے اکلوتے بیٹے تھے اور میں اپنے پاپا اور ماما کی اکلوتی بیٹی۔ بس یہی ہمارا مختصر خاندان تھا۔
 عدا بھائی مجھ سے پندرہ سال بڑے تھے۔ ان کی شادی کو نو سال ہونے والے تھے اور ان کے ہاں

تیسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے دو ماہ بعد بڑی ماما اور ان کی واپس آج ہی ہوئی تھی۔ اور میرے ٹیل ہو جانے والے کارنامے کے متعلق بھی انہیں بتا چل چکا تھا۔
 ”سازہ! ہماری بیٹی کو اتنی دور مت بھجواؤ۔ بھلا اس چپکتی مینا کے بغیر ہم رہا میں گے۔“ ڈیڈی فوراً جذباتی ہو گئے تھے۔
 ”بھائی جان! اس تلاق کو نبیلہ ہی سدھار سکتی ہے۔ شاید میٹرک میں یہ پاس ہو ہی جائے۔“ ماما بھی جذباتی ہو گئی تھیں اور مجھے بھی کروا دیا تھا۔
 ”مجھے آرٹس پڑھنے دیتیں تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔“
 ”زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔ دماغ کو بھی کبھی زحمت دے لیا کرو۔“ ماما کو میرا بیچ میں بولنا قطعاً نہیں بھایا تھا۔
 ”سازہ! ساجی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ نیچے کاشوق اور دلچسپی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ ہمیشہ کی طرح پاپا اور ڈیڈی میری حمایت میں بولے تھے۔
 ”تپ کی ان ہی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“ ماما کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ میں نے جیبی برائی اور تپہ بولی سے خوب انصاف کیا اور دعا پڑھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔
 صبح ہر صورت مجھے اسلام آباد جانا تھا اور آج کی رات میں جی بھر کر سونا چاہتی تھی۔ بد قسمتی سے میں ماما اور پاپا کی اکلوتی اولاد تھی۔ اگر ان کے اور بھی تین چار بچے ہوتے تو شاید ماما کی توجہ بٹ جاتی۔ مگر ہمارے خاندان میں بچوں کا فقدان تھا بلکہ فطرتاً مناسب ہو گا۔
 اللہ بخشے داوی مرحوم جب زندہ تھیں تو ماما اور بڑی ماما کی ہر وقت شامت آتی رہتی تھی۔ انہیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ ان کی اولاد کی بہت کم ولادت ہے۔ بڑی ماما ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ اسی لیے ان کی پلہ بچت ہو جاتی تھی۔ البتہ میری ماما پر تو داوی کا اثر و پیشتر عذاب نازل ہوتا رہتا تھا۔

”سازہ! اس ”شیرنی“ کو پیدا کر کے گویا کے ٹوکا پہاڑ سر کر لیا ہے۔“ داوی بھی میری اچھی صحت سے خاصا جلتی تھیں۔ یہی حال نبیلہ پھوپھو کا تھا۔
 ”دماغ کو زحمت جو نہیں دیتی۔ اسی لیے گوشت کا پہاڑ بنی جا رہی ہے۔“
 انہوں نے میرے بھرے بھرے سڈول سر لپے کو گوشت کے پہاڑ سے تشبیہ دے کر میرے نازک جذبات کو بری طرح سے مجروح کر دیا تھا۔ اپنی تو صرف دو ہی مٹھی سی تاؤ کی طرح ”جی“ سوکھی پائیں جیسی دو بیٹیاں تھیں اور ڈگریاں میرے حصے کی بھی اٹھنی کر رہ گئی تھیں۔ اس طرح کے رویوں کی میں بچپن سے ہی عادی تھی۔ میری صحت اور تعلیم یہ دو ایسے مسئلے تھے جو میرے خاندان والوں کے لیے مسئلہ فلسطین بن چکے تھے۔ نہ تو میں ماما داوی اور پھوپھو کی خواہش کے مطابق اپنی صحت و دانشنگ کے شوق میں تیار کر سکتی تھی اور نہ ہی میٹرک میں مجھ سے پاس ہوا جا رہا تھا۔ یہ دونوں کام یوں لگتا تھا جیسے میرے اختیار سے باہر ہیں۔
 کھانا پینا چھوڑ کر میں کیسے ٹی بی کی مرلیضہ بن سکتی تھی؟
 ”سوکھی سڑی ہڈیوں کی ڈھانچہ سی ساجہ مراد بھلا کیسی لگتی؟“ یہ سوچ ہی مجھ پر کچھ طاری کر دیتی تھی۔ سو میں ڈٹ کر تینوں وقت کا کھانا کھاتی تھی۔ ماما کی گھوڑیوں کی پرداہ کیے بغیر۔ اور رپا بھائی کا مسئلہ۔ تو شاید کسی نہ کسی طرح میرا میٹرک میں اے پس آ جاتا اگر ممانے آرٹس پڑھنے دیتیں۔ شاید اس وقت میں اردو ادب یا فائن آرٹ میں اپنا نام پانچلی ہوئی۔ مگر پائے میری قسمت مجھے تو ابھی تک برقی کرنٹ اور مقناطیسیت کے درمیان تعلق کو معلوم کرنے والے کا نہیں بتا تھا کہ وہ فلیمنگ ہے نیوٹن ہے فیراڈے ہے یا پھر اور سڈ ہے۔
 اپنی تازہ ترین بے عزتی پر میں جی بھر کے تمللا رہی تھی۔ اس تمللاہٹ نے تو زندگی بھر میرے ساتھ ہی رہنا تھا اور اب جو نبیلہ پھوپھو کے پاس بھیج کر مجھ

بے چاری پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے مگر بھلا ہو میرے پیارے ڈیڈی کا۔ انہوں نے صبح صبح ناشتے کی میز پر ایک جذباتی تقریر کر کے ماما کے ارادوں کو ڈانٹوں ڈول کر دیا تھا۔ تب ہی تو ممانے شمو کو میری پیکنگ کھولنے کا آرڈر دے کر کھینچے حد سے زیادہ مسرور اور شاد کر دیا تھا۔
 ڈیڈی کی بے پایاں محبت پر پہلے بھی مجھے شک نہیں تھا مگر اب تو اس محبت پر گویا مہر لگ چکی تھی اور اوھر ڈیڈی میرے کان میں کہہ رہے تھے۔
 ”ان دونوں خواتین کے ہاتھ سے بندہ مرنا کھانے کھا کر ہم نے بھلا مرنا تھا کیا؟ مجھے اپنی بیٹی کے ہاتھ سے بنی کافی پیسے بغیر بند بھلا آ سکتی تھی؟“
 ”مگر ڈیڈی! یہ فرس اور فرس اور نیسٹری۔“ میں رو دینے کو تھی۔
 ”ارے“ چوبلے میں جھوٹو فرس کو۔ کوئی ضرورت نہیں، تمہاری جان کو غم لگانے کی۔ اگلے سال آرام سے پیچھے لیٹا۔“
 پاپا نے لا پرواہی سے میرے شانے تھپتھپائے۔ ایسے ہی تو میں اپنے پاپا اور ڈیڈی کے گیت نہیں گاتی تھی۔ انہوں نے بھی مجھے پاپا سے ہونے نہیں دیا تھا۔ ان کی ایسی ہی محبت کی وجہ سے میں ابھی تک میٹرک میں اپنی ہوئی تھی۔ دراصل رزلٹ آنے کے بعد ماما مار کٹائی کا پیرینڈ لکھ گئی تھیں۔ اور پھر میں تین چار گھنٹے سوگ کی کیفیت میں گزار دیتی تھی پھر میری سوچی سوچی آنکھیں دیکھ کر ڈیڈی اور پاپا جی جان سے میری بہت بندھ جاتے تھے۔ ان سے میری ایڈوکیٹ رائے جیسی مولی مولی آنکھوں میں آنسو جو نہیں دیکھے جاتے تھے۔
 ”ساجی! اینشن نہیں لیتا بیٹا!“ کرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔“ تم ایک دفعہ پھر کو بخش کرو، محنت کرو۔“ یہ ڈیڈی کے الفاظ ہوا کرتے تھے اور ماما سچا ہوا جانتی۔
 ”بھائی جان! آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں، یہاں مینسٹر، لی نہیں دی جاتی ہے۔“

”مگر یہ ٹینشن کتنی تو اس کا طول اور عرض اتنا پھیلا ہوا نہ ہوتا۔“ اسود بھائی بھی میری ”صحّت“ کے دشمنوں میں سے تھے۔
 ”ہونہ“ خود بڑے اسرارٹ ہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”بک بک سن لو بس۔“ مہاراجے سے بولیں۔ ”جاؤ“ اسود کے لیے چائے بنا لاؤ۔“

”کلام کے وقت ساجیہ یاد آجاتی ہے۔“ میں کہنے سے باز نہیں آئی۔ ”فری سے کہیں چائے بنا لائے۔“ میں نے شان بے نیازی سے کہا۔

”مجھے جو شانہ میں بیٹہ۔“ اسود بھائی نے ناگواری سے کہا۔ ”سماجی کے علاوہ کوئی اچھی چائے بنا ہی نہیں سکتا۔“ اب وہ میری تعریف کر رہے تھے۔ جسے میں سرا سر خوشاں سمجھ رہی تھی۔

”مسک مت لگائیں۔“

”یہ مسک کیا ہوتا ہے؟“ وہ حیران ہوئے۔ ”مک بات تو ج ہے۔ میری بسن سے اچھی کوئی چائے بنا ہی نہیں سکتا۔“

”ہسن۔“ صدے کی شدت سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ نجانے ہر خوبصورت اور قابل لڑکے کو میں ہسن ہی کیوں لگتی تھی۔

اگر شادی ہو جاتی تو کم از کم پڑھنا تو نہ پڑتا۔ اور میں واحد ایسی لڑکی تھی جو اپنے لیے بھرے پرے کھانے پینے کے شوقین سرسالی کی دعا میں باغی تھی۔ جنہیں کھانے پینے میں اپنا گرویدہ بنا لیتی اور کم از کم وہ مجھ سے میری ذکریوں کے بارے میں نہ پوچھتے۔

مما کے نزدیک میں ساری دنیا کی لڑکیوں سے زیادہ نالاٹ، جاہل اور کندھ بن تھی۔ مگر دل ہی دل میں وہ میرے ٹھیکہ دار کے قابل ضرور تھیں۔ میں ہر فن میں طاق تھی اور میرے سکھ دے کا سارا کریڈٹ بڑی ماما کو جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے کوئنگ سے لے کر سلائی کڑھائی تک ہر فن میں طاق کر دیا تھا۔ مگر ماما کے نزدیک میری ان خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ

”ڈیلے لوگوں کے سپاہے“ کہہ کر میری ان خوبیوں کو مٹی میں بدل دیتی تھیں۔
 ”سماجی ایک تو نم نم جانے کس مراقبے میں چلی جاتی ہو۔“ سمانے خفگی سے کہا ”اب اٹھ بھی چکو۔“
 ”جاری ہوں۔“ میں دھپ دھپ کرتی کچن میں چلی گئی۔



میں بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ فٹ کری بنا رہی تھی۔ مچھلی کو پکین لگا کر پہلے سے رکھ دیا تھا۔ پیاز بھی گولڈن کر لی تھی۔ فٹ بھی فرانی ہو چکی تھی۔ بس آدھے گھنٹے کا کام تھا۔ ساتھ ساتھ اٹالین سلاڈ کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ یہ مینو ڈیٹی کی پسند کے مطابق صبح ہی میں نے ترتیب دیا تھا۔ کونہ بریانی دم پر تھی۔ اسی بل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں وقتاً فوقتاً سلیب پر رکھے نوٹس پر بھی نگاہ ڈال رہی تھی۔

”آف“ اب فون سننے لائونج میں جاؤں۔“ میں نے بھنا کر سوچا۔ فون بے چارن بچ کر خاموش ہو گیا تھا۔ تب ہی ماما اور بڑی ماماٹنگ دوم سے پر آمد ہوئیں۔ نجانے کون سی میٹنگ کر کے فارغ ہوئی تھیں۔
 ”کس کا فون تھا سماجی!“

”ابن انیمیم کا ہوگا۔“ میں نے رٹا لگاتے ہوئے سلاڈ کے لیے خروڑو کاٹنا شروع کر دیا۔

”ہیں۔ وہ کون ہے؟“ بڑی ماما بے حد حیران ہوئیں۔ فون کی گھنٹی پھر سے بجنے لگی تھی۔ بڑی ماما ابن انیمیم کے متعلق تفصیل پوچھنے کا ارادہ ترک کر کے فون اسٹینڈ کی طرف بڑھ گئیں۔ کچھ دیر بعد مجھے بڑی ماما کی افسردہ سی آواز سنائی دی۔

”کچھ دن بعد آئیں گے۔ کسی گھریلو پر اہم کی وجہ سے ان کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔“

”اس کے نصیب ہی ٹھنڈے ہیں۔“ ماما کی غمگین اور شدید پریشانی میں ڈوبی آواز سنائی دی تو میں نے چونک کر ان دونوں خواتین کے متشکر چہروں کی طرف دیکھا۔

کس کے نصیب ٹھنڈے ہیں۔ یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ ماما کا اشارہ یقیناً ”میری ذات گمراہی کی طرف تھا۔ شاید کچھ مہمانوں کو آتا تھا اور اب ان کا پروگرام بدل گیا تھا۔ یقیناً“ انہیں بھی میرے مونٹاپے کی بھنگ پڑ چکی ہوگی۔ ایسا ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

میری ذات کے ساتھ بے شمار مسائل کا انبار بھی جڑا ہوا تھا۔ ایک تو میری نالاٹھی، دو سرا میرا پھیلا ہوا وجود۔ تیسری یہ گز بھر لی زبان جو نئے نئے مہمانوں کو دیکھ کر منہ کے اندر رکھتی ہی نہیں تھی۔ کبکنت تیز گام کی طرح چلتی جاتی تھی۔

پچھلے دنوں کچھ خواتین آئی تھیں۔ میرے گورے بچے خوب بھرے بھرے سراپے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہیں۔ بعد میں کہلا بھیجا، انہیں آنے کی پوری نہیں چاہیے۔ بس مجھے بھی غصہ آگیا۔ بڑی ماما کی رسل ڈائری میں سے ان خواتین کا فون نمبر چرا کر وہ لئے لیے کہ یاد ہی کرتی رہیں گی تمام عمر اس شاندار بے عزتی کو۔ ساجیہ مراد کو آنے کی پوری کہنے کا خزانہ بھگتنا تو تھا ہی۔ میں نے بھی ان کے گنبے بیٹے کی شان میں ایسے ایسے القابات کہے تھے کہ بے چاری تمام عمر جلتی تھکتی رہیں گی۔

یہ دو سری مخوس ترین ٹیلی فون کال تھی۔ جو میری زندگی میں بھونچال لانے کا باعث بنی۔
 ماما کی پریشانی نے مجھے بھی بچ پریشانی کر دیا تھا، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ماما کو ان دونوں مجھے پڑھائی کی افادیت پر لے گئے لیکن دینے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ دو سرا حیرت کا جھنکا مجھے تب لگا۔ جب آرٹس کی کتابیں میری رائٹنگ ٹیبل پر جگ گئیں۔ ماما نے اپنی ضد چھوڑ دی تھی۔ ان دونوں کے سر سے مجھے ڈھیر سارا پڑھانے کا بھوت اتر چکا تھا۔ اب وہ مجھے سلم اینڈ اسارٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلسلنگ سینٹر کی میڈم سے بات بھی کر لی تھی۔

ادھر میرے بچن میں گھنے پر شدید باندی لگ چکی تھی۔ میں اپنے پسندیدہ جوائنٹ دیکھ کر اس قدر خوش نہیں ہوتی تھی، جس قدر کہ میں گھنے پر باندی کا نے مجھے صبح پانچ کا پید مز پانی پلا کر دیے کی ایک چھوٹی سی پانی پکڑا دیتی تھیں۔ تین دن اس ناانصافی اور ظلم کے بعد میں نے اپنے زرخیز دل سے کچھ نئی ترکیبیں نکال لی تھیں۔ کبھی ڈیڈی اور کبھی ماما سے دو تین سو روپے لینا میرا معمول بن گیا تھا۔ کیونکہ ماما اور بڑی ماما نے مجھے دہلا کرنے کے لیے جو عہد کر رکھا تھا۔ اس عہد کو مد نظر رکھ کر میری پانچ مٹی مٹی بند ہو چکی تھی۔

اب ماما مجھے پڑھائی پر نہیں بلکہ ڈانٹنگ پر بڑے بڑے اور بے لکچر دیتی تھیں۔
 ان دنوں ماما سب سے بڑی ٹینشن میرا بڑھتا ہوا وزن تھا۔
 جس دن میرا میٹرک کا شاندار رزلٹ آیا، یہ اسی دن کی بات ہے۔ دن میرے لیے خوشگوار نہیں تھا۔ حالانکہ ماما اور بڑی ماما میرے پھولے پھولے گلابی چہرے پر نہ جانے کتنی ہی بو سے دے چکی تھیں۔ ماما میرے اچھے رزلٹ پر پھولے نہیں ساری تھیں۔ اور ڈیڈی فخریہ کہہ رہے تھے۔

”میں نہ کتنا تھا سارا سماجی کو آرٹس پڑھنے دو، بچے کی دلچسپی اور شوق کو اولیت دینا چاہیے۔“ ماما آج ڈیڈی سے متفق ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کسی بھی قسم کی بحث نہیں کی تھی۔

رات کو خالہ نے ماما کو فون کر کے بتایا۔
 ”آپا! بڑی آپا نے اسود کے لیے تانیہ کو مانگا ہے۔“ اس خبر نے ماما کے چہرے کے سارے رنگ اڑا دیے تھے۔ شاید وہ بھی اسود بھائی کو بطور ولاد پسند کر چکی تھیں۔ تاہم بھائی کی خوشی پر انہوں نے کم طرفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پہلے چھوٹی خالہ کو اور پھر بڑی خالہ کو مبارکباد دی۔

ادھر میرے ارمانوں پر بھی اوس پڑ چکی تھی۔ تانی اور اسود بھائی سے اچھے اچھے گفتگوں وصول کر کے

میں نے بھی اوپر ہی دل سے انہیں مبارکباد دی۔ اگر اسود بھائی کے ساتھ بات بن جاتی تو میں نے ایف اے کے بجائے شادی کرنا تھی۔ مگر بڑے میرے نصیب جو بقتل حملے بالکل برف یا آکس کریم کی طرح ٹھنڈے تھے۔

خاندان کے سارے ہی لڑکے ایک ایک کر کے کھونٹے سے بندھ چکے تھے۔ حنا اور صبا جیسی نانا نچ لڑکیاں بھی دو دو بچوں کی اماں بن چکی تھیں۔ میرا دل جل جل کر خاک ہو رہا تھا۔ اور ادھر اسود بھائی اور غالی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

مما بھی ہنسی خوشی کبھی جینو تو کبھی بری کی شاہنگ کروانے چلی جاتی تھیں۔ بچن ان دنوں میرے صحت مند کندھوں پر تھا۔ سو میں جی بھر کر چٹ پٹے کھانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

ڈیڈی اور پاپا بھی خوب مزے کر رہے تھے۔ ان دنوں وہ دنوں کو پرہیز بھول چکا تھا۔ میں بھی فراموشی لست کو دیکھتے ہوئے مینو ترتیب دیتی تھی۔

بڑی ماما تو عرصہ ہوا بچن کو خیر یاد کہہ چکی تھیں۔ پاپی بلڈ پریشر کے مرض نے انہیں خاصا عاجز کر دیا تھا۔ اور

مما کو بھی میں اب کم کم ہی بچن کی طرف جانے دیتی تھی۔ مگر جب سے ماما کو میرے پھیلنے وجود کو دیکھ کر شاک لگا تھا اور میرا اب تک رشتہ نہ ہونے کی یہ بہت بڑی ”وجہ“ معلوم ہوئی تھی تب سے بچن میں میرے داخلے پر ابندی لگا دی گئی تھی مگر خیر اب تو آزادی ہی آزادی تھی اور میں اس آزادی سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔

شادی کے ہنگامے جوں ہی سرور بڑے ممانے میرا دوبارہ وزن کروایا اور پھر کچھ مدت پوچھے میں اپنا بندرہ کلو وزن بڑھا چکی تھی۔ ممانے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میں نے انٹر میں ایڈمیشن کیا لیا مصروف سے مصروف تر ہوئی چلی گئی تھی۔ پڑھائی اور کھانے کے علاوہ مجھے کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ بڑی ماما کرے میں داخل ہوئیں۔

”سناؤ! بانو کی روتی کارشتہ بھی ملے ہو گیا۔“ یہ خبر خاصی روح فرسا تھی۔

”جھا!“ ممانہ دے کے مارے بول ہی نہ سکیں۔

”اچھی خاصی موٹی اور ساٹنی سی بھی مگر پوزیشن ہولڈر تھی، مگر کچھ زیادہ ہو گئی تھی اسی لیے بے چاری بانو بہت پریشان تھی۔“ ممانے میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔

”چلو! بانو کی پریشانی تو دور ہوئی۔ لٹھ سب کی بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔“ بڑی ممانے صدق دل سے دعا کی۔ نظرس ہنوز مجھ پر تھیں۔ گویا خصوصاً ”میرے لیے بھی دعا کی گئی تھی۔“

”روتی باجی کی شادی میں کون جائے گا۔“ مجھے اپنے کپڑوں کی فکر ہو گئی تھی سو بے تابی سے پوچھنے لگی۔

”تم تو ہرگز نہیں جاؤ گی۔“ ماما کا انداز فیصلہ کن تھا۔

”کیوں؟ اب تو میں میٹرک بھی کر چکی ہوں۔“ میں نے روتی صورت بنا کر کہا۔

”بڑا تیرا لیا ہے تین سال میں میٹرک کر کے“ ماما تو ماسوں کی طرح طنز کرنے میں ماہر تھیں۔

”کر تو لیا ہے نا۔ اگر اس دفعہ بھی ٹیل ہو جاتی تو اچھا تھا۔“ میں گھس کر بولی۔

”بے وقوف! حق دراعتل نہیں۔ اگلے گھر جا کر نچالنے کون کون سے“ گل“ کھلائے گی۔“

”مجھے گل کو منہ لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو اچھی طرح سے خبر ہے میں ”گل“ سے کس قدر چڑتی ہوں۔“ گل ہماری بیڑوں میں پاپا کے دوست کی بیٹی۔ ان دنوں چھٹیاں گزارنے کینڈا گئی ہوئی تھی۔



میں اس وقت ٹیرس پریٹھ کر کیلوں کے ساتھ معمولی سا انصاف کر رہی تھی۔ صرف چھ کیلے ہی کھائے تھے۔ جب میری بیڑوں کے ٹیرس کی ریٹنگ؟

مجھے ایک سیاہ چمکتی آنکھوں والے خیر لڑکے نے مجھے ساٹواں کیا اٹھاتے دیکھ کر گویا کتنی مکمل کردی تھی۔

”اب مزید ایک بھی کیلا مت کھانا۔ ورنہ تمہارا نہ سہی، میرا اپنا معدہ تمہیں کیلے کھاتے ہوئے دیکھ کر پھٹ جائے گا۔ مانی گاڈ! پیٹ ہے کہ کونوں، ابھی دو سرخ سرخ سیب بھی پلیٹ میں ڈھک کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کسی اور کے معدے میں ڈالو گی؟“ وہ مسلسل بولتا ہوا بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے ٹیرس پر کود گیا۔ یہ کیلے سب تو مجھے، ہضم ہو سکتے تھے مگر ان خترم کی بے تکلفی ہر گز نہیں۔

”کون ہو تم؟“ میں نے اسے انی رُ جلال موڈ میں دباڑنے کی کوشش کی تھی مگر گلے میں کافی تکلیف دہ خراشیں پڑ گئیں۔

”میں دلوں کا کیف ہوں۔“ مقابل نے خاصا جھوم کر بتایا۔

”میں کہہ رہی ہوں! اپنا نام بتاؤ؟“ مجھے ایک دفعہ پھر تلخ تجربہ نا پڑا۔

”بیانا تو ہے۔ کیف ہوں، سرور ہوں، نشہ ہوں، خمار ہوں۔ مستی ہوں۔“ وہ پھر سے دلا بھرے انداز میں بولا۔

”یہ سارے نام تمہارے ہیں؟“ حق! مجھے صرف ایک نام بتاؤ۔“ میں نے جھاڑ کر کہا۔ دراصل میرا ارادہ یہ تھا کہ ریٹنگ پھلانگ کر ڈرا خسانہ آئی (گل کی می) سے شکایت لگا کر آتی ہوں کہ گھر میں کس بد تنزیب مسمان کو کھانا ہوا ہے۔ جو بغیر اجازت کے دوسروں کے گھروں میں گھس کر بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔“ خسانہ آئی تمہاری رشتے میں کیا لگتی ہیں۔“ میں نے آنکھیں دکھا کر پوچھا۔

”ڈیڈی کی بسن۔“

”یعنی تمہاری پھوپھو؟“

”یہی سمجھ لیں۔“ اب وہ ریٹنگ کے اوپر جھک کر ہمارے لائن کا جائزہ لے رہا تھا۔

”یہ پھول پودے کس نے لگائے؟“

”ساجیہ نے۔“ میں نے سوچا کیوں نہ تعریف ہی ہو رہی جائے۔

”یہ کون خاتون ہیں؟“ وہ چونک کر پوچھنے لگا۔

”میں اور کون۔“

”اوہ، تو آپ کا نام ساجیہ ہے۔“ اس نے آنکھیں سکڑ کر میری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ”آپ کا نام تو کوئی بھاری بھر کم قسم کا ہونا چاہیے تھا۔ دروازہ، سلطوت آرایا ہیرہ بیگم۔“

”کیا مطلب؟“ میں چیخ اٹھی۔ ”دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ کوئی میری صحت پر چوٹ کرے تو میں زخمی شیرنی بن جاتی تھی۔ کچھ میں فطرتاً جھگڑا لو تھی۔

دراصل اس کے پیچھے بھی بے شمار وجوہات ہیں۔ میرے گھروالوں کی بے شمار زیادیاں اور ظلم جو عمر کے مختلف ادوار میں مجھ پر نوتے رہے تھے۔ شروع سے ہی مجھے ہر بات پر ڈی گریڈ کرنا۔

میں جو عمار بھائی کے اتنے سالوں بعد اس ظالم گھرانے میں پیدا ہوئی تو ان لوگوں کو میری قدر کرنا چاہیے تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ شکرانے پڑھنے، نیازیں بانٹنے، مگر وہ کچھ یوں۔۔۔ ماما مجھ جیسی جنتی بچی کو پیدا کر کے بیمار پڑ گئی تھیں۔ سارے گھر والے معصوم سی گول گو تھی بچی کو بھول بھال کر ماما

کے غم میں ادھ موے ہونے لگے۔ پاپا نے اس وقت جذبات میں آکر یہ تک کہہ دیا تھا۔ ”اُس سے بہتر تھا، میں بے اولاد ہی رہتا۔“ یہ اس نازک گھڑی کی جذباتی سی کیفیت تھی۔ بعد میں پاپا نے مجھے اپنی آنکھوں کا ستارہ اور پھیلی کا چھالانا چاہا تو میری ہلکے مامور میان میں کود پڑیں۔

”مراد! کیا ساسی کو بگاڑ دوس گے۔ ایک ہی ہماری بیٹی ہے۔ اس کی تربیت میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔“ ممانے دو سال کی عمر میں تربیت کرنے کے چکر میں مجھے جو خونخوار نظروں سے گھورتا شروع کیا تو اب تک یہی سلسلہ چلتا آ رہا ہے۔

میں بچپن سے ہی ماما کے ظلم و جبر کا نشانہ بنتی رہی ہوں۔ ظاہر ہے، انکوئی تھی۔ سارے ستم مجھ مسکین

پر ہی ڈھائے گئے۔ عمارتھائی ایک تو مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اوپر سے بلا کے فرماں بردار۔ مجھے دیکھ دیکھ کر تو ماما کو ہول پڑتے تھے۔

”ہائے لڑکی ذات اور ایسی بد زبان۔ بولتی ہے تو گویا چھت پھاڑنے کے ارادے سے۔ کبھی عمار کو اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا ہے۔“

ماما کا خیال تھا قصور میرا بھی نہیں میں اپنی پھوپھی کا مزاج چڑالائی ہوں۔ سو میری گرم مزاجی سے گھر

والوں نے سمجھو تا کر لیا تھا۔ بس یہی وجہ تھی کہ میں۔۔۔ ”محترمہ! آپ کس مراقبے میں چلی گئی ہیں؟“ وہ بالکل میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا اور میں جو باضی کی بھول ہلہلوں میں گم بہن سے اب تک اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک دم چونک کر خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم ابھی تک بیس کھڑے ہو؟“ جوں ہی میری نظر اس کے ہاتھوں تک لگی۔ میرا پارہ چڑھ گیا۔ وہ مکینہ لیووں کے رس میں کئے ہوئے سیب چٹ کر گیا تھا۔

”کس کی اجازت سے تم نے میرے سیب کھائے ہیں؟“

”کھانے پینے کے معاملے میں بھلا اجازت کیسی؟“ اس نے میرے ایک ٹشو بھی اٹھا لیا۔

”جاؤ یہاں سے۔۔۔ ورنہ میں چوکیدار کو بلا لاؤں گی۔“ میں نے اسے دھکا دیا۔

”چوکیدار نے بھلا یہاں آکر کیا کرتا ہے؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”تمہیں اٹھا کر دوسرے ٹیرس پر پھینک دے گا۔“

”اس میں اتنی جان ہے؟“ وہ ہمارے چوکیدار کی صحت پر چوٹ کر رہا تھا۔ ”یہ کام تو آپ پر سوٹ کرتا ہے اور آپ ماشاء اللہ سے کون بھی سکتی ہیں۔“

”کون سا کام؟“

”اب کیا تفریح کروں۔ خیر اللہ آپ کو نظرد سے بچائے۔“ وہ بیک وقت میرے صحت مند سراپے پر بھی چوٹ کر رہا تھا۔ یہاں میرا غصہ کرنا تو جتنا تھا اور غصہ چونکہ میری ناک پر دھرا رہا تھا، سو میں فوراً ہی پھٹ پڑی۔

”جاتے ہو یہاں سے کہ میں ماما کو بلاؤں؟“

”انتا تردد کر کے نیچے جانا ہے تو میرے لیے چائے بھی لیتی آنا۔ میں یہیں دسٹ کروں گا۔“ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ سجا کر کہا۔

”تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ میں نے چھری اور پلیٹ اٹھا کر کہا۔

”اگر نہ جاؤں تو۔۔۔؟“

”تم کس کی اجازت سے ہمارے ٹیرس پر آئے ہو؟“ میں نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

”میں نے دل کی اجازت سے۔“ وہ مزے سے بولا اور پیر جھلٹا کھڑا ہو گیا۔

”مس ساجیہ مراد! ہم پھر ملیں گے ابھی چلتا ہوں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ دوسرے ہی پل ریٹنگ سے کود کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ جبکہ میں بھناتے ہوئے نیچے اتر آئی۔



میرا انیف اے میں پاس ہو جانا میرے گھر والوں کے لیے ہفت اقلیم کی دولت مل جانے کے برابر تھا۔ ڈیڈی پایا اور ماما تو اس خوشی میں کسی بڑی ضیافت کا اہتمام کرنا چاہتے تھے مگر نیلہ پھوپھو کی بیماری کی خبر نے سارا پروگرام دھرم بھرم کر دیا تھا۔

میرے اور ڈیڈی کے علاوہ سب ہی اسلام آباد چلے گئے تھے۔ ڈیڈی کو آفس سے چھٹی نہیں ملی تھی اور میں ڈیڈی کی وجہ سے گھر میں رہنے کے لیے تیار تھی۔ ویسے بھی میں پھوپھو کے سوالات کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی۔ انہوں نے تو میرا ناک میں دم کر لیا تھا۔

”سائنس کیوں نہیں پڑھی؟ ایڈمیشن کیوں نہیں لیا؟ کون کون سے بھجکٹ پڑھو گی؟“

اب بھلا پھوپھو کو کون بتائے میں نے مزید نہ پڑھنے کا اعلان کر دیا تھا اور میری پیاری ماما نے اس اعلان کو سن کر فی الحال جوتا اٹھانے سے پرہیز ہی کیا تھا۔ دراصل میرے انٹرمیڈیاس ہو جانے کی خوشی میں انہوں نے اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہا تھا۔ اور فی الحال میری بے عزتی کرنے کا ارادہ ترک کر کے اسلام آباد سدھاری تھیں۔

چونکہ پڑھائی کا بوجھ تو ہٹ چکا تھا۔ سو میری آج کل تمام تر توجہ کامرکزنی دی اور کچن تھا۔

اس دن بھی میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ ڈیڈی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس کی ترکیب میں نے ایکسٹری چیٹس کی آغوش سے سیکھی تھی۔

میں مختلف مسالوں کے پیسٹ کو چوٹی کی ہوئی چائے کے اوپر لگا لگا کر فرانی کر رہی تھی جبب شمو نے مجھے کچن میں آکر اطلاع دی۔

”ساجی بی بی! مہمان آئے ہیں۔“

”کوئی! اس وقت کون ویلا (فاسغ) آگیا ہے منہ اٹھا کر۔“

میں لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا اور زریہ کریم میں مکس کر رہی تھی۔ چائے کو مسالوں میں لگانا تھا۔ اس کام سے فاسغ ہو کر میں نے ہاتھ دھوئے اور سر پر فنگی شمو کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”کون ہے؟“

”خود دیکھ لیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”دیکھنے کی چیز ہے قسم سے۔“ شمو اپنی اوقات پر اتر آئی۔

”کون نہیں۔“ میں نے اسے ڈیڈی کر کہا۔ ”مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھالیا ہے؟“

”جی، بالکل۔“ اس نے زور سے سر ہلایا۔

”تو پھر جانے لے آنا۔“ میں لاؤنج میں گے مر

میں اپنا حلیہ دیکھ کر بولی۔

”چائے کے ساتھ کیلاؤں جی؟“

”نگھنسی، رول، مہتاب اور ہاں ایک بھی رکھ لیتا“ ڈیڈی کے کوئی دوست ہی ہوں گے۔ ”میں نے اندازاً سوچتے ہوئے ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا، مگر صوفے پر موجود شخصیت کو دیکھ کر میرے منہ میں گویا کڑوے باوام آگئے۔

”تم؟“ میں صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

”جی، میں۔۔۔ آپ کیوں شاکدہ لگی ہیں؟ یہاں بیٹھ جائے، کہیں گرمیت جائے گا صدمے کی شدت سے۔“ وہ اخلاقاً اٹھتے ہوئے بولا۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“ میں ناراضی سے بولی۔

آج بہت دن بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید بیچ کے دنوں میں وہ کہیں چلا گیا تھا۔

”مبارک باد دینے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”ہائے“ اسے بھی خبر ہو چکی۔ ”میرا دل ڈوب کر ابھرا۔“ پھر نمبر بھی جان چکا ہو گا۔

”انتاجیران کیوں ہو رہی ہیں۔ دراصل مجھے رخسانہ آغی نے بتایا تھا۔ سوچا، مبارک دے آؤں۔ ایمان سے بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر کے آپ نے انٹرمیڈیاس کر لیا ہے۔“ وہ بیچ بچ بڑی خوشی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر مجھے صاف طنزیں لگا۔

”ٹھیک ہے، خیر مبارک۔“ میں نے اوپری دل سے کہہ ہی دیا۔ ”ویسے تم اتنے دن سے کہاں تھے؟“ نظر نہیں آئے۔ میں نے ایسے ہی بات بڑھانے کی غرض سے پوچھ لیا تھا۔

”آپ نے مجھے کس کیا؟“ وہ تو ایسے کھل اٹھا تھا گویا گلاب کا پھول ہو۔

”لو، جی! اگر لوکل۔۔۔ یہاں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ میں نے منہ بنا کر سوچا، مگر اس کا دل تو جتنا بھی مناسب نہیں تھا، سو لفظوں کا ہیر پھیر کر کے بولی۔

”ٹیرس پر نہیں دیکھا سو اس لیے پوچھ لیا۔“

”دراصل میں کچھ دن تک ”سوگ“ کی کیفیت

میں رہا ہوں۔

”سوگ؟“ میں چونکی۔ ”بھلا کیسا سوگ؟ کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہہ دیا؟“ میری تجسس پسند فطرت انگڑالی لے کر جاگ اٹھی تھی اور فوری طور پر میرے ذہن نے ایک کہانی کا تانا بانا بھی بن لیا تھا۔ گل کے پیار میں پاگل لیکن۔۔۔ گل کا ہری جھنڈی دکھانا اور پھر کیف کا سوگ میں اتنے دن غمزدہ رہنا۔۔۔ اوپر میرے اندر مارے تجسس کے گدگدی ہونے لگی تھی اور میں بس قیافہ ساری کہانی کو جاننے کے لیے بے چین ہو گئی تھی اور اس لمحے مجھے بھول گیا تھا کہ میری پہلی ملاقات کافی ناگوار رہی تھی۔

”بس جی، کچھ نہ پوچھیں۔۔۔ لوگوں کے درزنے چرے ہیں۔“ وہ زنجیدگی سے بولا۔

”کس کے؟“ میں حیران ہوئی۔

”ہماری پھوپھو محترمہ۔“ وہ جل جھن کر بولا۔

”فکران کے دچرے کہاں ہیں؟ مجھے تو صرف ایک چروہی دکھائی دیتا ہے۔“ میں نے ہونٹ پن کی استہرا کر دی تھی۔

”میرا کہنے کا یہ مطلب نہیں۔“ وہ جھنجھایا۔

”یہ جو میری پھوپھو ہیں نا۔۔۔ ایک نمبر کی بد عمد ہیں۔“ وہ خوب جلا بیٹھا تھا۔

”انہوں نے کیا کیا؟“

”پھوپھو نے کہا تھا ان چھٹوں میں وہ ضرور ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں گی مگر اب وہ مکر گئی ہیں۔“

”کیف نے بسور کر دیا تھا اور اوپر میرا منہ اتر گیا۔ جو کچھ میں سنا چاہتی تھی اور جس محبت کی کہانی کا مجھے انتظار تھا، سب خواب ہوا، ٹھکڑا ہوا اور نکلا گیا؟

”تم گل کو ساتھ لے جاؤ۔ وہ بھی بس آنے ہی والی ہے۔“ میں نے اس کو تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا مگر وہ بول اچھلا گیا اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔

”توبہ کریں جی، پھوپھو کو تو اس لیے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ چند دن کے لیے ہی سہی، میری بچن سے جان چھوٹ جائے گی، میں بھی چار دن سکھ کا سانس

لے سکوں گا۔ مجھے پاگل کہتے تھے کانا ہے کہ میں گل کو لے جاؤں گا کہ میری مزید سختی آجائے۔ میں دو گھنٹی کے لیے بھی بچن سے باہر نہ نکل سکوں۔“ کہہ تو وہ ٹھیک ہی رہا تھا۔ گل کی بڑحالی اور کام چوری مجھ سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا۔ گلی اور سستی خصوصاً بچن کے کاموں میں محترمہ گل پر ہی ختم ہوتی تھی۔

”بچن کے کاموں سے تو گل کی جان جاتی ہے۔“ میں نے شو کو زلی گھیس کر اندر آنے دیکھ کر گھورا۔ اس کے لیے اتنا اہتمام کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ بڑوس سے تو آیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شو کا بھلا کیا تصور ہے۔ آرڈر تو میں نے خود ہی دیا تھا اور اوپر کیف نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔ وہ کباب کھاتے ہوئے بول رہا تھا۔

”اسی لیے تو میرا اور فیلی پلٹون کا مشترکہ فیصلہ ہے کہ گل ہماری بھابھی نہیں بن سکتی۔“ میں اس کے لیے چائے بناتے بناتے اچھل کر رہ گئی۔ اس نے بات ہی کچھ ایسی کی تھی۔ میرا چونکنا فطری تھا۔

”ہائے گل بھی ٹھکانے لگنے کے قریب قریب پہنچ گئی۔“ مدد سے میرا بازو بھر خون خشک ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے بی اے کی موٹی موٹی کتابیں گھومنے لگی تھیں۔ اگر اس سال بھی کوئی امید کی کرن نظر نہ آتی تو مجھے قوی یقین تھا، ممانے اسلام آباد سے واپس آکر ایڈمیشن فارم میرے منہ پر ضرور دے مارا تھا اور مجبوراً ”دوتے دھوتے مجھے اس فارم کو بھرنا تو ضرور ہی تھا۔ ورنہ ممانے دھناتی کون کروا تا۔

”پھوپھو کی خواہش ہے۔ میرے بھائی سے گل کی بات بن جائے مگر میرے اور میری پلٹون جیسے ظالم سماج کے ہوتے ہوئے بھلا یہ بات بدن سکتی ہے۔“

”مگر گل میں بھلا کیا کی ہے؟“ میں نے مرے

مرے لہجے میں کہا۔

”نہیں،“ کی تو کوئی نہیں۔۔۔ ہمارے لیے تو بہت اچھی ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ ہمیں گھر سنبھالنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے نہ کہ کوئی ایسی آجائے جو

سارے نظام کو ہکا بکا کر رکھ دے۔ اب دیکھیں نا، گل سال کے چھ مہینے بیرون ملک کے دوروں پر رہتی ہے۔ ایسے میں ہمارے گھر کی بھلا کیا حالت ہوگی اور ویسے بھی گل اپنے کینڈا دالے چاچو کے بیٹے میں انٹرنسٹ ہے۔ پھوپھو خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ خیر یہ ان کا اور گل کا ذاتی معاملہ ہے۔ امید ہے گل پھوپھو کو قائل کر ہی لے گی۔“ کیف نے چوتھا کباب اٹھاتے ہوئے وضاحت کی تھی۔ میں اس کی بات سمجھ کر سر ہلانے لگی۔

”میں پھوپھو کو لینے کے لیے آیا تھا۔ ایک بھائی کے لیے ایک لڑکی دیکھی تھی مگر وہاں بات بنتے بنتے رہ گئی۔“ کیف کا منہ اتر گیا تھا۔

”مگر کیسے؟“ میں نے بے ساختگی سے پوچھ لیا۔

”محترمہ کو کچھ پکارنا نہیں آتا۔“

”ہائے صرف اتنی سی بات؟“

”یہ اتنی سی بات نہیں۔“ کیف نے چکن رول اٹھایا اور پھر دوبارہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ ”جو خاتون بچن کے نام سے گھبراتی ہوں۔ انہیں شوکیس میں سجانے کے لیے تو گھر نہیں لے کر جاتا۔“

”ہاں، تو تم نے ٹھیک کہا۔“ میں نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔ کیف کو ویسے بھی بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ وہ بہت اچھی طرح سے مقابل کو قائل کر لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صرف چند دنوں میں میری کیف کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اس کا بھی زیادہ تر وقت ہمارے گھر میں گزرنے لگا تھا۔ کیف نے بڑی ممانور میری ممانے بھی خاصی جان پہچان بتائی تھی۔ ایک تو وہ بلا کا باتی تھا۔ ایسے ایسے لطفے اور چٹکے چھوڑا کہ ہنس ہنس کر اگلا بندہ بے حال ہو جاتا۔ البتہ کیف کی ہمارے گھر میں آمد و رفت رخسانہ آئی کو پسند نہیں آتی تھی۔ اکثر جب کیف میاں ہوتا تو آئی اسے کسی نہ

کسی بہانے بلانے آجاتی تھیں۔

کیف چند ہفتوں کے قیام کی غرض سے یہاں آیا تھا۔ اس کے آفس کا کوئی کام تھا۔



اس دن میں مارکیٹ سے کچھ ضروری سامان لینے کے لیے گئی تو کیف سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ دو دن بعد نظر آیا تھا۔ ان دنوں کام میں بہت مصروف تھا۔ اسی لیے پارک میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ ورنہ تو روزانہ ہی میں اسے قریبی پارک میں ٹھلے اور موبائل فون پر مصروف دیکھتی تھی۔ اس وقت بھی اسے فٹ پاتھ پر چل تندی کرتے دیکھ کر مجھے بے ساختہ خوشی محسوس ہوئی۔

”کہاں تھے اتنے دن؟“ میں نے بڑے بڑے تھیلے اس کے ہاتھ میں زبردستی تھماتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ مصروف تھا۔ تم سناؤ؟ آج کل کیا ہو رہا ہے۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح شائستگی بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”بس، وہی بڑحالی کا روٹا۔“ میں نے دکھی دل سے بتایا۔ ممانے آتے ہی میری ہنسی سی جان پر پھر سے کتابوں کا بوجھ لاد دیا تھا۔ بقول ممانے جب تک شادی نہیں ہوتی، فارغ رہنے سے بہتر ہے، مصروف رہو اور اب تو میں سچے دل سے شادی کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس دفعہ بھی میں ہرگز باس نہیں ہو سکوں گی اور فیل ہونے سے بہتر تھا، میں کسی کی بے رنگ زندگی میں رنگ بھردوں۔ مگر مسئلہ تو صرف یہ تھا کہ خاندان کا کوئی بھی مرغا بچ نہیں پایا تھا اور خاندان سے باہر نکلنے کے ممانے مجھے اجازت نہیں دے رکھی تھی اور نہ ہی میرا ایسا کوئی ارادہ بھی تھا۔

”آئی کا ارادہ تم سے جب کروانے کا ہے؟“ کیف کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔

”نہیں تو۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کیا ضرورت ہے، خواہ مخواہ تمہیں تکلیف دینے کی۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”آئی کو چاہیے تمہاری شادی کر دیں۔“

”لوٹی، کرو لگ۔ یہاں کوئی پروڈنل آتا تو بت بات بھی تھی۔ بندہ روڈ ہو کر گھروالوں کو شاوی کے لیے منوا ہی لیتا۔“ میں نے کڑھ کر سوچا۔
 ”تم بھوک ہڑتال کرو۔“ کیف نے اسے نئی راہ دکھانا چاہی تھی۔

”ممان اوچھے جھکنڈوں سے متاثر نہیں ہو سکتیں۔“ میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔
 ”اچھا، ایک اور طریقہ بھی ہے تم بیمار پڑ جاؤ۔“
 ”بھگے کیسے؟“

”بھئی، ہر روز جھوٹ موٹ کا دور رہنا لیتا۔“
 ”پھر ممالوگ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگیں گی، سارا بھائی اچھوٹ جائے گا۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔
 ”تم ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا۔“

”میں نہیں جاؤں گی مگر ڈاکٹر خود چل کر میرے پاس آجائے گا۔“ میں بیزاری سے بولی۔ ”کچھ اور سوچو۔“
 ”کہہ دو، میری یادداشت چلی گئی ہے ابھی میں گاڑی نکال کر لاتا ہوں۔ معمولی سی ٹکر کے بعد تم بے ہوش ہو جانا۔“ اس نے ایک اور نادر ترین حل پیش کیا جسے سن کر میرا منہ بن گیا تھا۔

”ناک میرا دماغ علان ہوتا شروع ہو جائے اور پھر ماما اور بابا کو پتا چل جائے کہ میں انہیں پریشان کرنے کے لیے ڈرامے کر رہی ہوں۔“
 ”ایک اور حل بھی ہے میرے پاس۔“ وہ پھر سے سوچ میں گم ہوا۔

”جلدی بتاؤ۔“ میں بے صبری سے بولی۔
 ”تم خود کشی کرو۔“

”ہائے خوشی۔“ میں گویا بدک کر دو رہوئی۔
 ”یعنی مرجاؤں؟ محض پڑھائی سے بچنے کے لیے۔“
 میری آنکھوں کو ڈیلے گویا بار پھر نکلنے لگے۔
 ”نہیں تو۔“ وہ گویا جھنجھلا گیا۔ ”مرنے کے لیے کون کہہ رہا ہے۔ صرف خود کشی کی کوشش کرنا۔“
 ٹیرس سے چھلانگ مار دیتا۔ ”وہ اطمینان سے بولا۔

”ناکہ میری ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ میں لنگڑی

ہو کر بستر سے لگ جاؤں۔“ ایسے خوفناک مشورے نے مجھے پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔
 ”بدو! وہی ان سے چھلانگ مارنا کہ ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ جائیں۔ بس اس کا وہی ان رکھنا کہ اس منتظر کو کوئی دیکھ لے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ میں نے مشکوک انداز میں اسے گھورا۔ ”تم مجھے دنیا سے بھگانے کے طریقے کیوں بتا رہے ہو۔“
 ”ایک آخری آئیڈیا بھی ہے میرے زرخیز دماغ میں۔“ کیف نے جنگل بنا کر کہا۔

”مجھے تو معاف کرو۔“ میں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔ میں سڑک پار کرنے لگی تھی۔

”ارے سن تو لو۔“ وہ میرے پیچھے بھاگا چلا آیا۔
 ”کیا ہے؟“ میں ناراضی سے بغیر رکے بولی۔
 ”تو تم شاوی کرو۔“ اس نے پھر سے میرا دل جلا یا۔
 ”کس سے۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے دانت پیش کر مہلتے ہوئے کہا تھا۔

”ایک سے۔“ وہ میرے سامنے کھڑا بڑے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔ یوں کہ میرا اطمینان پل بھر میں ہوا ہو گیا۔
 ”مگر۔“ میں نے کچھ بولنا چاہا تھا مگر کیف نے گویا ہاتھ اٹھا کر میری بات قطع کر دی۔

”کوئی اگر مکر نہیں۔ کیا میں اور میری ماما تمہارا ہاتھ مانگنے آجائیں؟“ اب وہ بڑے صاف اور دونوک انداز میں پوچھ رہا تھا اور میری حیرت کی گویا انتہا ہو چکی تھی۔
 ”مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ میں کاٹا کرہ گئی۔ ”بھلا یوں کھڑے کھڑے رشتے طے پاتے ہیں؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔“ وہ پر جوش سا بولنے لگا۔
 ”تم ہمارا آئیڈیل ہو ساجی! ہمیں جس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ لڑکی صرف تم ہو سکتی ہو۔ تم میں جو خوبیاں موجود ہیں۔ ہمیں ایسی ہی خوبیوں والی لڑکی کی تلاش تھی۔ میری تلاش یہاں آ کر ختم ہو چکی ہے اور میں تمہیں اپنی بھائی بنانا چاہتا ہوں۔“

ہائے، مجھے کھڑے کھڑے ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ اپنی اپنی تعریفوں نے تو میرے حواس معطل کر دیے تھے۔ اگر کچھ سنسنیل ڈرافٹ کے تاثرات جانچ لیتی تو ضرور ٹھنک جاتی۔ مگر کیا ہے کہ مجھے کسی کو جانچنا، رکھنا یا سمجھنا تو کبھی نہیں آیا۔ میں بے وقوفی کی حد تک سادہ ہوں۔ ان دنوں مجھے اپنی بے وقوفی کی خبر نہیں ہو سکی تھی، مگر وقت بہت بڑا استاد ہے۔ جو باتیں ماں، باپ اور کتابیں تک سمجھا نہیں سکتیں ان باتوں کو وقت اچھی طرح سے ذہن نشین کر دیتا ہے۔ اور وقت کی شاگردی میں رہنا کوئی آسان کام نہیں۔



یہ ان دنوں کی بات ہے جب رخسانہ آنٹی نے اچانک کینیڈا شفٹ ہو جانے کا اعلان کر دیا تھا۔ شوہر اور بیٹی چونکہ برطانیہ میں تھے سو وہ تنہائیوں سے گھبرا کر کینیڈا چلی گئی تھیں۔ ان کی انیکسی میں ابھی تک کیف ہائس پذیر تھا۔

آنٹی کے چلے جانے کا بڑی ماما اور میری ممانے خاصا صدمہ لیا تھا۔ عرصہ دراز سے وہ ہمارے پڑوس میں رہ رہی تھیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد یوں لگتا تھا گویا براہِ والا گھر سٹاؤں میں ڈوب گیا ہے۔ آنٹی چلی گئیں تو کیف بھی گدھے کے سر سے سینک کی طرح چند دنوں کے لیے غائب ہو گیا تھا اور میں جواتنے دنوں سے اس کی عادی ہو چکی تھی، ایک دم ہوا کھلا کر رہ گئی اور جس دن وہ واپس آیا تھا۔ میں گویا پھٹ پڑی۔
 ”بھئی بتائے، کہاں دفن ہو گئے تھے؟“

”سائنس تو لینے دیتا ہوں۔“ وہ گھاس پر پھسکر مار کے بیٹھ گیا تھا۔

”جلدی سے بکو۔“ میں غصے سے بولی۔ اسود بھائی اور غانی کے بعد کیف ہی تھا، جس سے میں اس قدر بے تکلفی سے پیش آتی تھی اور دوسرے ماما اور بابا، کیف کی شرافت، نجابت کو دیکھ کر مطمئن تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے کیف سے ملنے اور گپ شپ سے

نہیں روکا تھا اور ویسے بھی، کم ہون سا ہر وقت ملنے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ زیادہ تر پارک میں ہی ملاقات ہوتی تھی۔ وہ پارک میں بچوں کے ساتھ دلی ہال کھیلتا تھا اور میں ماما کے ہزار مرتبہ مجبور کرنے پر چار پانچ راؤنڈ لینے کے لیے نکل آتی تھی۔ جب تک میں راؤنڈ لیتی تھی۔ اتنی دیر تک وہ والی بال کھیلتا رہتا تھا۔ جوں ہی میں تھک ہار کر بیچ پر بیٹھ جاتی۔ وہ بال پھینک کر بھاگ آتا تھا۔

”یو سا ہے نا، میری وہ اس کا برتہ ڈے تھا۔“ وہ پسینہ صاف کرتا ہوا بولا۔ یو سا اس کی ”وہ“ تھی یعنی دوست، ”مگنیترا“ یا پھر بیوی۔ اس نے بھی ”وہ“ کی وضاحت نہیں کی تھی۔ ”میں نے بھی کبھی وضاحت طلب نہیں کی تھی۔ دراصل مجھے کریدنے کی کبھی بھی عادت نہیں رہی تھی اور نہ ہی میرا کیف کے ساتھ ایسا کوئی ریلیشن تھا جو یو سا کے بارے میں کلنٹنس رہتی۔ وہ مجھے خاصا ہمدرد، مخلص اور ساہو مزاج لگا تھا اور ان دنوں تو میری ماما کے کہنے پر وہ مجھے آکناکس اور انگلش بڑی دل جمعی کے ساتھ پڑھا رہا تھا اور میں وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی تھی کہ کیف سے اچھا کوئی آج تک مجھے پڑھایا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھایا۔

ماما کیف سے بہت خوش تھیں کیونکہ میرے مستہلی ٹیسٹ دیکھ کر ماما کا دل خوش ہو گیا تھا اور وہ اس کامیابی کا سارا کریڈٹ کیف کو دے رہی تھیں۔ میری محنت کو وہ کسی کھاتے میں نہیں سمجھتی تھیں۔ ”تو پتا کر جاتے۔“ میں نے ناراضی جتائی۔

”کیوں بھی آپ نے مجھے مس کیا تھا؟“ وہ صاف مجھے چڑا رہا تھا۔

”ہو نہ ہوئی نہیں۔“
 ”تم تو خوش ہوگی، پڑھائی سے جان چھوٹی رہی اتنے دن۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ میں جربز ہوئی۔
 ”تم آوارہ گردی کر آئے؟“

”لڑکی! احترام سے بلایا کرو۔ میں تمہارا استاد ہوں۔“ وہ خوار خواہ استاد بنا۔

”تمہاری یو سا ٹھیک ہے؟“ میں نے جان کر اسے چھیڑا۔

”ایک دم ٹھیک ہے، فرسٹ کلاس۔“ وہ دور سے آکس کریم والے کو آؤ کیہ کر اٹھ گیا تھا۔

”اور تم؟“

”میں تمہارے سامنے ہوں۔“ وہ دو آکس کریم لے آیا تھا۔

”بڑے فریش لگ رہے ہو۔“ میں نے اپنا پورٹ فلیور بنڈ دیکھ کر منہ تالیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”آکس کریم۔“

”مگر مجھے مینگو فلیور پسند نہیں۔“ میں نے ناک چڑھائی۔

”تو نہ کھاؤ۔ مجھے دے دو۔“ وہ اطمینان سے بولا تھا۔

”تم سے ایک بات کرنا تھی ساجی!۔“ کافی دیر سوچنے کے بعد وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ میں کچھ چونک گئی۔

”کیا؟“

”وہ واصل میری لما آنا چاہتی ہیں۔“ بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

”تو آجائیں۔۔۔ اس میں سوچ بچار کرنے والی کیا بات ہے۔“ میں اس کی بات کا مقصود نہیں سمجھی تھی۔ واصل مجھے بات تو کیا، لہجے سمجھنا اور چہرے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔

”میرا مطلب ہے، ایک خاص مقصد کے لیے آئیں گی۔“ وہ سر ہٹائے گھاس کے شٹکے نوج رہا تھا۔ اس کے قریب ہی خشک گھاس کے شٹکوں کی ایک ڈھیری لگ چکی تھی۔

”کیسا مقصد؟“ اب میں کچھ کچھ سمجھ تو چکی تھی۔

”تاہم مزید وضاحت بھی ضروری تھی۔

”ایک کے لیے آئیں گی۔ میں نے تمہاری اتنی تعریفیں کی تھیں کہ وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی ہیں۔“

”اس نے تعریف کا ایک جال میری طرف پھینک دیا

تھا اور میں اس جال میں الجھنے کے قریب قریب پہنچ چکی تھی۔ واصل اپنی تعریف کے ناپسند ہوتی ہے اور میری جن خوبیوں کی میرے گھر والوں کے نزدیک کوئی وقعت یا اہمیت نہیں تھی۔ وہ اپنی خوبیوں کو میری نظر میں اور برہنہ کر پیش کرتا تھا۔ واصل یہ بھی ایک فن ہے شائستگی اور سلیقے کے ساتھ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فن۔ یہ ہنر بھی کسی کسی کو آتا ہے۔

”تم بہت اچھی کونگ کرتی ہو۔ تم میں سلیقہ ہے۔ گھر سنبھال سکتی ہو۔“ لما کہتی ہیں ایک لڑکی کو ہر فن میں طاق ہونا چاہیے اور وہ عورت ہی کیا، جو گھرواری کے قریب سے واقف نہ ہو۔“ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور براثر لہجے میں کہہ رہا تھا اور اس کی باتوں سے اس کے عجیبے کی تاثیر سے کوئی بھی عقل و فہم والا بندہ قائل ہو سکتا تھا جبکہ میں تو پھر ایک احمق اور بدھوشی لڑکی تھی۔ واصل میرے لیے بے وقف اور کم عقل جیسے الفاظ ہی مناسب تھے۔ اس وقت میں سفاکانہ حد تک خود کو احمق ترین مخلوق بھی کہہ سکتی ہوں، ہاں اس وقت مجھے یہ الفاظ بہت زہریلے اور انا مذاق اڑانے والے محسوس ہوئے تھے جب ممانے مجھے بتایا کہ

”تم احمق اور پاگل ہو ساجی! ہمیں یہ سب تمہارے لیے بہتر نہیں لگ رہا۔“

”آپ تو چاہتی ہی نہیں، میں قدردان لوگوں میں جاؤں جو میرے سلیقے سے متاثر رہیں۔ جو میری ڈگریوں کی بجائے میرے ہاتھ کے ڈانٹنے کی تعریف کریں۔ پلیز ماما! میں ساری زندگی احساس کمتری کے ساتھ نہیں گزار سکتی۔ مجھ سے یہ طعنہ بھی نہیں برداشت ہو سکے گا کہ میں کند ذہن تھی یا پھر میرا اکیڈمک ریکارڈ اچھا نہیں تھا۔“ میں احساس کمتری کا شکار تھی اور اسی خوف کے زراثر میں نے کیف کے بھائی کے حق میں دھڑ دے کر اپنے لیے ایک بھرے پرے کنبے کا انتخاب کر لیا تھا۔

میرا ٹھنڈا ذہن کار زلٹ آیا اور میں خوش قسمتی سے پاس ہو گئی۔ ابھی میری اس خوشی کو سلیپیوٹ کر رہے تھے کہ ایک نیا واقعہ رونما ہو گیا۔



پوری زندگی میں شاید پہلی مرتبہ میں نے خوشی کا جال جلنے کی تیاری کی تھی اور اس سے پہلے کالج کے لیے ضروری چیزوں کی شاپنگ بھی کی تھی۔ ماما اور بڑی ماماں کا پلاٹ پر حیران تھیں۔ اور ڈیڈی پاپا بے انتہا خوش۔

مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میرے اندر تبدیلیوں کی اصل وجہ کیف کی ذات تھی۔ وہ میرے لیے ایک مخلص دوست ثابت ہوا تھا اور اس نے مجھے احساس کمتری کے بحسور سے نکال دیا تھا۔ اس نے میری ذات کی اہمیت کو اپنے جاندار لفظوں کا پیرا بن دے کر مجھے پہلے سے بھی زیادہ بااعتماد کر دیا تھا۔ یہ بات بھی مجھے بہت بعد میں پتا چلی تھی کہ واصل کیف کا مقصد مجھے بااعتماد کرنا نہیں بلکہ میرا اعتماد جویتے کی کوشش کرنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی اس دن کی جب میں کالج جانے سے پہلے جھٹ پٹ ناشتہ تیار کر رہی تھی۔ ماما اور بڑی ماماں اٹل اپنے کمروں میں تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا نماز کے بعد سو جاتے تھے۔ جب تک وہ فریش ہو کر میز پر آتے تھے۔ میں ان کی پسند کا ناشتہ تیار کر چکی ہوتی تھی۔ یہی میری روٹین تھی۔ اس وقت بھی میں نے شمو کے ساتھ مل کر رتن میز پر سجاوے تھے جب کیف کی کل نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

میں موبائل اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ میرا راز تھا کہ ساتھ ساتھ یونیفارم بھی پرپس کر لوں گی کیونکہ میں جانتی تھی کیف لمبی بات کرنے کا راز وہ رکھتا ہے۔

”استاد محترم! خیریت تو ہے۔ صبح صبح فون کھڑا کیا ہے؟“ میں نے موبائل کلن سے لگا کر استری کا پلگ لگاتے ہوئے کہا۔

”ہاں ایسے ہی۔“

”جھوٹ نہ بولو۔“ مجھے قطعاً یقین نہیں آیا۔

”سویرے سویرے میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔“

”اتنے بھی تم سچے نہیں ہو، دوست!“ میں نے طنز بہہ کہا۔

”یہ تو تم نے سچ کہا۔ سو فیصد ٹھیک کہا۔“ اس نے فوراً اتفاق کر لیا تھا۔

”ہم ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔“ میں خواہ مخواہ اترائی۔

”جائے کیوں وہ منس دیا۔“

”تم بہت سلو ہو۔“

”شکر ہے نوازش۔“ میں اسے چڑانے کی غرض سے بولی تھی۔ شاید وہ میری ساڈی پر چوٹ کر رہا تھا۔

”بہت نادان بھی ہو۔“

”ٹھیک فرمایا آپ نے۔“ میں مزے سے بولی۔

”اور تم بہت چالاک ہو۔“

”ہاں واقعی۔“ وہ پھر سے مسکرا دیا تھا اور اس کی ہنسی کی آواز سن کر میں نے بس ایسے ہی عام سے لہجے میں کہہ دیا تھا۔

”اور کبھی کبھی یہی چالاک آپ کے منہ پر بھی آپڑتی ہے۔ خود کو عقل کل نہیں سمجھنا چاہیے۔“

”بڑی عقل کی باتیں کرنے لگی ہو۔“ دوسری طرف حیران ہونے کی اداکاری کی گئی تھی۔

”آخر کس استاد کی شاگردی میں ہوں۔“ میں نے عاجزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دوسری طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

”فون کیوں کیا تھا؟“ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا سوال دہرایا۔ کپڑے استری ہو چکے تھے۔ اب میں جوتے نکال رہی تھی۔

”آج لما تمہارے گھر آئیں گی۔“ بالآخر اس نے فون کرنے کی وجہ بتائی دی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے میں غصہ سی گئی تھی اور میرے دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب ہو گئیں۔ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں کیا تھا اور میری خاموشی سے وہ اپنے مطلب کے معنی اخذ کرنے لگا۔

”تمہیں برا لگا؟“ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مجھے ہر گز برا نہیں لگا مگر پھر بھی اس نے پوچھا۔

”مجھے برا کیوں لگے گا۔ آخر کل میرے استاد محترم

کی اما آئیں گی۔ مجھے تو ابھی سے مینو کی فکر ہو گئی ہے۔" کچھ دیر بعد میں نے کافی ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ اپنی کوئنگ کے جوہر دکھا کر لما کو امپریس کر لینا۔" وہ شاید مسکرایا تھا۔

"مجھے بھلا کیا ضرورت ہے۔" میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا اور جگے سے کل منقطع کر دی تھی۔ دراصل میں کچھ گھبرا گئی تھی اور ایسی گھبراہٹ کا شکار بھی میں پہلی مرتبہ ہوئی تھی اور یہ گھبراہٹ کیف کی لما کو دیکھ کر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ان کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ پہلی نظر میں ہی بندہ کچھ گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہو جاتا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی شخصیت کے لیے کون کا سا لفظ مناسب تھا۔ باوقار، مہذب، بارعب یا براسرار انہوں نے ماتھے تک دوپٹہ لے رکھا تھا۔ ہوں کہ آنکھیں تک دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جھکا ہوا سر اور جھکی ہوئی آنکھیں۔ خاموش لب ساوہ ساچرہ، آنکھوں میں سادگی تھی کوئی سوال نہیں تھا۔

صاف بات تو یہ تھی۔ بڑی مہما اور میری مہما کو کیف کی لما پسند نہیں آتی تھیں اور جب گھر والے پسند نہیں آئے تھے تو پھر ایک کو دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ڈیڈی اور پاپا خاموش تھے فی الحال انہوں نے کوئی رائے نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے ایک سے لے کر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی جبکہ مہما اور بڑی ممانے صاف کہہ رہا تھا۔

"کافی بھری پُری ٹیلی ہے۔ ایک کے پانچ بھائی، ماں اور خیر سے معذور دادی بھی موجود ہیں۔ مجھے تو ساجی کے لیے یہ رشتہ پسند نہیں۔ اوپر سے ایک کی ماں نے ہمارے ساتھ کلام تک نہیں کیا۔"

"برا خاندان ہونے میں کیا برائی ہے۔" اس وقت تو ڈیڈی اور پاپا کی موجودگی کے باعث میں کچھ نہیں بولی تھی۔ تاہم ان کے اٹھنے کے فوراً بعد مجھ سے رہا نہیں گیا تھا سو بولی اٹھی۔

"تمہیں کچھ پتا نہیں ساجی! یہ بیوی کی بات ہے۔

ہمارے درمیان ہی رہنے والا۔ ہم جو مناسب سمجھیں گے۔ وہ ہی فیصلہ کریں گے۔" خلاف معمول ممانے مجھے بغیر ڈپٹے آرام سے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

"ایک ہی تو پوائنٹ مجھے اپنے حق میں مناسب لگا تھا اور آپ اسی پر اعتراض کر رہی ہیں۔" میری دیرینہ خواہش پوری ہونے والی تھی۔ کسی بڑے خاندان کا حصہ بننا میرا خواب تھا۔ ایسا گھر جس کے کمین میری تعلیم کی بجائے میرے سلیقے اور سکھارے کے کن گامیں اور میں اپنے خلوص اور خدمت گزاری کے جذبے کی بدولت ان کے دلوں کو جیت لوں اور میں جانتی تھی اس وقت مہما اور بڑی ممانے مجھ پر فخر کرنا تھا۔ فی الحال تو وہ میرے اکلوتے پرن کی وجہ سے تذبذب کا شکار تھیں۔

"ختم شروع سے تیار اور سکون ماحول میں رہنے کی عادی ہو جانا ہمارے لیے ایک پورے گھنٹے کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو گا۔" بڑی ممانے مجھے سمجھانا چاہا تھا کہ میں نے ان کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

"مہما! یہ پوائنٹ تو بہت دیک ہے۔ میں ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔" بات تو کافی بے شری والی تھی۔ اپنے پڑپول پر یوں کھلی دلی گفتگو کرنا مگر میں مشرقی لڑکی بننے کی اوکارتی کر کے خاموش رہنے کے چکر میں اتنا اچھا پڑپول ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اب تو کوئی ڈھنگ کا پڑپول آیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے جو خواتین ہمارے گھر آچکی تھیں۔ وہ سب سے پہلے میرے میٹرک میں گریڈ اور نمبر پوچھنے لگتی تھیں اور جنہیں خبر ہو جاتی تھی کہ میں نے میٹرک تین سال میں کیا ہے۔ تو وہ مڑ کر دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھیں۔

"پلیز مہما! محض اس وجہ سے آپ کیف کے گھر والوں کو انکار مت کیجیے گا۔" میں نے التجا کر کے کہا تھا اور اب تو مجھے پورا یقین تھا کہ مہما جو بی اتار ہی تیں گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس ممانے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بھرائی آواز میں بولیں۔

"بیٹا! ہم تمہارے لیے ہر چیز پر فیکٹ وکھنا چاہتے ہیں۔ تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو۔ ہر ماں باپ اپنی اولاد کے لیے حساس ہوتے ہیں۔" مہما بہت دیر تک مجھے سمجھاتی بھجھاتی رہی تھیں۔ زمانے کی اونچ نیچ۔ اتار چڑھاؤ ڈنڈگی کے نشیب و فراز۔ اور میں خاموشی سے سر جھکائے سنتی رہی تھی۔ مگر میرا دل پھر بھی ایک کے حق میں دوڑنے لگا رہا تھا۔

"ایک دفعہ دیکھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔" بہت دیر سوچنے کے بعد بڑی ممانے دھیمی آواز میں کہا تھا۔

"مجھے سفینہ (کیف کی لما) کا رویہ بہت عجیب لگا تھا بھابھی! مہما اور بڑی ممانا بہت دیر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں سو میں چپکے سے اٹھ گئی۔



آنے والے بہت سارے دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے تھے۔ مہما لوگ ایک دفعہ جملہ جا کر ایک کو بھی دیکھ آئی تھیں۔ ڈیڈی اور پاپا کے علاوہ اسوہ بھائی اور عدا بھائی بھی ایک سے مل کر آئے تھے اور وہ انہیں ہر لحاظ سے اچھا لگا تھا۔

"اپنی ماں کی طرح ہے۔ مہذب، خاموش۔۔۔ باوقار اور۔۔۔" یہ مہما کا ایک کے لیے بھروسہ تھا۔ مہما کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں اور میں ان کی خاموشی سے بے چین ہو گئی۔

"اور کیا بھلا؟ براسرار۔۔۔؟" میری زبان بھلا رک سکتی تھی۔ ممانے مجھے ہمیشہ کی طرح گھوری سے نوازا تھا۔

"نہیں۔ بہت سنجیدہ مزاج۔" مہما مجھے نہیں بلکہ غالی کو بتا رہی تھیں جو خرابی طبیعت کی وجہ سے جملہ نہیں جاسکتی تھی اور اب جسکے لینے کے لیے صبح صبح اسوہ بھائی کے ساتھ نازل ہو گئی تھی۔ اسوہ بھائی اسے ڈراپ کر کے اپنے آفس چلے گئے تھے۔

"ایک کا برٹس اچھا چل رہا ہے ماشاء اللہ سے، اس نے چند سال میں ہی بہت ترقی کی ہے۔" بڑی ممانا

ایک سے کچھ زیادہ ہی سٹار ہو گئی تھیں۔ "شکل و صورت کیسی ہے۔ گورا ہے؟ کالا ہے؟ سناٹا ہے؟ کیا ہے؟" غالی نے چل کر پوچھا تھا۔ اب کے ممانے غالی کو گھورا۔

"بہت خوش شکل ہے۔ ساجی کے ساتھ جے گا۔" جواب بڑی ممانی طرف سے آیا تھا اور اس جواب نے مجھے بھی مطمئن کر دیا تھا۔

ایک سے چھوٹے چار اور بھائی تھے سب سے بڑا ایک تھا اور اس کے بعد کیف، عون، فائز اور اشعر تھے اور یہ بات سن کر کریم حیران رہ گئے تھے کہ عون اور فائز دونوں شادی شدہ تھے۔ ممانے اس بات پر بھی خاصا اعتراض کیا تھا کہ بیوی کو چھوڑ کر چھوٹے دونوں کی شادی کیوں کی ہے۔ ویسے میری مہما کو اعتراضات تو اور بھی بے شمار تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ مہما کو اپنی قدرے فرہی مائل، بلا لائق سی بیٹی کے لیے ایک جیسا اسرار، خور و اور لائق فائق لڑکا پسند آ گیا تھا۔ سو بھرا پر اکتنبہ بھی ممانے نظر انداز کر دیا تھا اور سفینہ آئی کا رویہ بھی۔

بیویوں کے درمیان تمام معاملات طے پا گئے تھے۔ اب مجھے بی اے کی بجائے بیہ ہی کرنا تھا مگر نچانے کیوں سب کچھ حسب فضا ہونے کے باوجود اندر نہیں عجیب سی بے قراری چٹکیاں بھرنے لگی تھیں اور میں کافی دن تک تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ شاید مہما اور پاپا سے دوری کا احساس دل میں چھپن دے رہا ہے۔ دل کو او اسی کی دہن چادر میں لپیٹ رہا ہے مگر یہ احساس پاپا کے گھر سے لے کر ایک کے گھر تک میرے ساتھ رہا تھا مگر اس سے بھی پہلے کچھ اضطراب تو میرے اندر خود بخود بھرنے لگا تھا۔

ایک دن کیف چلا آیا تھا۔ وہ جاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ جا کر اپنی شادی کی شاپنگ کر لوں۔ اس میں کوئی اعتراض والی بات بھی نہیں تھی۔ سو ممانے مجھے اجازت دے دی تھی۔

تقریباً "تین دن تک شاپنگ کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اگرچہ شاپنگ بھی میں نے نہ ہونے کے برابر کی تھی۔

ایک تو موت میں کافی ہلکے ہلکے اور کم قیمت کے کپڑے لیے تھے۔ دوسرے مجھے ویسے بھی بھاری لباس سے اچھن ہوتی تھی اور جب لینے کی باری آتی تو کیف نے مجھ سے پوچھا۔
”لنگا کیسا ہونا چاہیے؟“
”لنگا نہیں۔“
”تو پھر؟“

”میں کچھ اور لوں گی۔“ میں نے بھاری بھر کم لینے دیکھ کر ایک ہلکا سا نفیس کام والا شلوار قمیض پسند کر لیا تھا۔

”شائنگ پنک لے لو، ایک کو یہ کٹر بند ہے۔“ کیف نے مجھے سرخ رنگ کا انتخاب کرتے دیکھ کر فوراً کہا تھا۔ حالانکہ سرخ رنگ کو میں اپنا کٹی کٹر سمجھتی تھی۔ یہ رنگ میرا پسندیدہ تھا مگر اس کے باوجود میں نے ایک کی پسند کو اولیت دی تھی۔

شائنگ کے دوران یو سہا ہمارے ساتھ رہی تھی۔ یو سہا، کیف کی کزن اور منگیت تھی اور جس طرح کیف اس پر دل کھول کر خرچ کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ کیف یو سہا سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ کیف کی یو سہا کے لیے محبت اس کے ہر ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی اور میں وہ وقت سے کہہ سکتی تھی کہ اتنی خریداری میں نے نہیں کی تھی، جس قدر یو سہا نے کی تھی۔ منگے ترین کپڑے اور سونے کے زیورات، اس کے علاوہ بھی نجانے کیا کچھ۔

میرا سلمان کیف نے میرے حوالے کر دیا تھا اور یو سہا پوری گاڑی اپنی چیزوں سے بھر کر جہلم چلی گئی۔ حالانکہ جب میں برائیدل وریس خرید رہی تھی تب کیف برابر مجھے خنک رہا تھا۔

”ہاتھ ہولا رکھنا فریڈ! تمہارے انہوں نے میری جیب میں کچھ خاص رقم بھر کر نہیں بھیجا۔“
”اپنے بھائی سے کہنا وہ شادی کر رہا ہے یا پھر برتھ ڈے سیلیبریٹ کر رہا ہے۔“ میں نے جھنک کر کہا تھا۔

اگرچہ مجھے خود ان باتوں کا خاص خیال تھا مگر کیف کا بار بار جراتنا مجھے بہت برا لگ رہا تھا۔
پھر ایک دن کیف نے اچانک فون کر کے مجھے حیران کر دیا۔ ”ایک سے بات کرو گی؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

”میں۔۔۔ مگر کون؟“ میں گھبرا اٹھی۔ شادی میں چند دن تو رہ گئے تھے اور آج سے پہلے اور سے کوئی ایسا معاملہ سامنے نہیں آیا تھا اور پھر مہمان سے پوچھنے بغیر میں بھلا کیسے بات کر سکتی تھی۔

”بس ایسے ہی تم نہیں کرنا چاہتیں تو کوئی بات نہیں۔“ کیف نے مزید کچھ سننے سے پہلے فون رکھ بھی دیا تھا۔ جوتھو تھا کہ کیف کو بھی میں سمجھ نہیں پاتی تھی۔ عجیب سا بندہ تھا۔ گھڑی میں تو کہ گھڑی میں ماش۔

ان ہی انجھی سلجھی سوچوں سمیت شادی کا دن بھی آگیا تھا۔ اس دن عام لڑکیوں کی طرح مجھ پر بھی گھبراہٹ سوار تھی اور اُنسو بھی وقتاً فوقتاً بغیر کسی وجہ کے گرتے جا رہے تھے۔ ماما اور بڑی ماما میرے سامنے خود کو پیش رکھنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر یہ کوشش کبھی کبھی ناکام ہو جاتی تھی۔ پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ گھر کے لان میں شامیانے لگے تھے۔ رات کو مہندی کی تقریب کا انتظام ہوٹل میں تھا۔ البتہ بڑی ماما کی خواہش تھی کہ رخصتی کسی ہوٹل سے نہیں بلکہ گھر سے ہونا چاہیے۔

نکلنے سے کچھ دیر پہلے میں نے عجیب سی دہلی دہلی سرگوشیاں سنی تھیں اور کچھ دیر بعد مکمل کر بات سامنے آگئی۔ کیف نے مہمانوں سے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا۔

”آئی جی! آپ نکلیں ناے میں، حق مہر کے طور پر ایک سے کچھ بھی لکھوائیں۔ ساجی کے تحفظ کے طور پر۔“

”پرینا! اس کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ شرعی طور پر ہو گا۔ ہمیں منظور ہے۔“ ممانے سلیقے سے کہا تھا۔

اگرچہ بات تو درست تھی مگر میرے والدین اس چیز کو کافی غیر مناسب سمجھتے تھے۔

”نہیں آئی! ضرورت ہے۔ یہ ساجی کا حق ہے۔“ وہ اپنی بات پر زور دے کر بولا تھا۔ ”میں ایک سے بات کرنا ہوں۔ وہ اپنا گھر چار فرنگی میں سے دو فرنگی اور کارخانہ ساجی کے نام لکھ دے۔ یہ ساجی کا حق مہر ہو گا۔“

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ ماما گھر آکر بولیں۔
”انتہا بھی زیادہ نہیں۔ میں نے کہا نا، یہ ساجی کا حق ہے۔“

اس کا انداز دو ٹوک قسم کا تھا۔ ماما جی ہو گئی تھیں۔ اگرچہ مجھے بھی یہ حق مہر بہت زیادہ لگ رہا تھا مگر میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھی ورنہ ضرور بول اٹھتی۔

”ایک کیا سمجھو گا ہم کس قدر لالچی ہیں۔“ مجھے یہی سوچ رہے ڈال رہی تھی۔ میں ماما کو منع کرنا چاہتی تھی مگر کیا اور ڈیڈی کے ساتھ مولوی صاحب کو دیکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ اگرچہ سینے میں آیا تھا کہ ایک نے کیف کے اس مطالبے پر کٹانی ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ وہ مان نہیں رہا تھا مگر نجانے کیسے کیف نے اسے منا کر ہی دم لیا۔ کیف کے خلوص اور ہمدردانہ فطرت کی میں کچھ اور قائل ہو گئی تھی۔

سینہ بیکم یعنی کیف کی ماما اس وقت بھی کچھ نہیں بولی تھیں، جب حق مہر کے متعلق دہلی دہلی سرگوشیاں ہونے لگی تھیں۔ تب بھی وہ خاموش اور سر جھکائے بیٹھی رہی تھیں۔ نہ ان سے کسی نے پوچھا تھا، نہ مشورہ لیا اور نہ ہی بڑھ چڑھ کر انہوں نے بولنے کی کوشش کی تھی۔ ایک چپ تھی ان کی، جو گھر آنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

بس انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر خاموش لبوں سے ایک دعا دی تھی اور میرے لیے ان کی یہ دعا پوری زندگی کا حاصل تھی۔

”سدا سکھی اور آپار ہو۔“



ایک کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات نے میرے سارے خدشات دور کر دیے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ وہ ضرور حق مہر میں لکھوائی جانے والی لمبی چوڑی جائیداد کے طعنے دے گا جتنے گایا کبھی بکھار طنز کی مار مارے گا۔ تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے لیے ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر ثابت ہوا تھا اور اس کی محبت پر پہلے روز ہی پیرادل ایمان لے آیا تھا۔ سب سے بڑی سترت بات یہ تھی کہ اس نے میرے تعلیمی ریکارڈز کا ریکارڈ ہرگز نہیں لگایا تھا بلکہ اس معاملے میں بھی اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا تھا۔ عموماً وہ زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی اس کی گپ شپ نہ ہونے کے برابر تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنی ماں اور بھائیوں سے بے حد محبت کرتا تھا اور مجھ سے بھی اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

”ساجیہ! مجھے امید ہے تم میرے گھر میں ایک اچھا اضافہ ثابت ہو گی۔ پلیز! میری ماں اور بھائیوں کی عزت کرنا۔ ان کا خیال رکھنا۔ اس گھر میں سب سے مظلوم، ہستی میری وادی ہیں۔ میں تم پر کوئی بوجھ نہیں ڈال رہا، بس دن میں کبھی گھبراؤ ان کی خبر گیری کر لیا کرنا اور دوسرے نمبر پر میری ماں ہیں۔ ان کی ذات بھی قابل توجہ ہے۔ تھوڑا سا وقت انہیں بھی دے دیا کرنا اور بس، میرا تم سے کوئی مطالبہ نہیں۔ میں ہمیشہ تم سے تخلص رہوں گا اور تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ بس ایک وعدہ کرو، کبھی بھی اپنے دل کو کسی اور کے خیال سے آلودہ نہیں کرو گی۔ میں سب کچھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہوں مگر بے وفائی ہرگز نہیں۔ تمہیں کیف نے میرے لیے پسند کیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم ہم سب کے حق میں بہتر ثابت ہو گی۔ ہم بھائیوں میں بہت پیار ہے۔ ہمارے اس پیار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرنا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اسے سرشار کر دیا تھا۔

میرے لیے ایک کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ جس طرح ایک نے مجھے اپنے دل میں جگہ دی تھی، اسی طرح وہ بھی میرے دل کے ہر گوشے میں بسا گیا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ ہوش چاہے جانے کے لائق بہت اچھا بہت نیک، ہر نوع میں ایسے ہی لوگ، پیشہ دلوں پر حکومت کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ رخسانہ آئی اسی لیے تو ایک کو اپنا اور اپنا جانا ہوتا تھا۔ جب اوھر سے دل برداشتہ ہو گئیں تو پھر جی اور شوہر کے پاس چلی گئیں۔ ایک اور کیف کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کسی اور نے حاصل نہیں کی تھی۔ عون اور فائزہ دونوں نے انٹر کے بعد شادی کر لی تھی اور دونوں ہی ایک کے کاروبار سے منسلک ہو گئے تھے۔ دونوں کو مناسب جاب ایک نے ہی مل سکی تھی۔ اگر وہ اپنی فیملی کا بوجھ نہ اٹھائیں۔ اشعر ہاشم میں مقیم تھا۔ کم کم ہی گھر آتا تھا۔ البتہ عون اور فائزہ کی بیویاں نیا اور سی گھر میں ہی ہوتی تھیں اور گل سے بھی بڑھ کر ست اور کابل تھیں۔ پورا گھر نجمہ بی کے کندھوں پر تھا۔ وہ سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ جو مرضی پکاوتی تھیں اور جیسا مرضی پکائیں یہ سب صبر اور شکر کر کے کھا لیتے تھے کہ گھر کی خواتین نے بھی ضرورت کے وقت بھی کچن میں نہیں جھانکا تھا۔

کیف ٹھک ہی کستا تھا۔ ان کے گھر میں سلیپے، قرینے کی بہت سی تھیں۔ تاہم یہ بات سرا غلط تھی کہ کچن کیف سنبھالتا ہے۔ شاید اس وقت مذاقاً اس نے کہہ دیا ہو گا تاہم میں تو صرف نجمہ بی کو ہی ہر ایک پر رعب حملے اور کاموں کا رونا روتے دیکھ رہی تھی۔ ایک بہت مصروف رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا کہ وہ رات سے پہلے گھر نہیں آتا تھا۔ نجمہ بی نے بتایا کہ ایک کھانا باہر سے کھا لیتا ہے اور مجھے سالن کے نام پر ملو بے دیکھ کر ان کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ ایسے ملو بے سے باہر کا کھانا ہی، بہتر تھا۔ مگر گھر کے مرو

بے چارے بھلا کیا کرتے۔

لانا کا زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزر رہا تھا۔ وہ پورا دن عبادت میں مشغول رہتی تھیں۔ گویا انہوں نے

دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ ایک عرصے سے ان کی یہی رویت تھی۔ تینوں وقت کا کھانا انہیں کمرے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ سی، آثار قدیمہ جیسی واوی بھی پبلک پر چت لینے بس پھت کو گھورتی رہتی تھیں اور جب اس کام سے تھک بار جاتیں تو پھر گہری نیند میں گم ہو جاتیں۔ نجمہ بی جیسے تیسے بد مزہ سی خنی انہیں پلا جاتی تھیں۔

نیا اور سی نے بھی پاس اور واوی پاس کے کمرے میں جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اسے ہی لگائے اپنے اپنے کمروں میں بندنی دی دیکھنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دونوں کے پاس ایک ایک بچہ تھا اور ان کی اپنی بے شمار مصروفیات تھیں۔ عموہ گھر پر بھلا کیوں توجہ دیتیں۔ سونے کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ ان کا تیسرا محبوب ترین مشغلہ پارلر کے چکر لگانا تھا۔ صحت اور حسن کو نکھارنے کے علاوہ کوئی اور کام ان کے پاس نہیں تھا۔

اس گھر کی خواتین کی رویتیں دیکھ کر تو مجھے غش آنے لگے تھے۔

”نیا اور سی گھر کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتیں۔“ میں پورا ہفتہ ماما کے گھر رہنے کے بعد واپس آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اسی گندگی، غلاظت نے استقبال کیا تھا۔ رانی اگرچہ صفائی کر کے گئی تھی مگر پھر بھی جگہ جگہ فروٹ کے چٹکے اور ٹائیوں کے ریمز زبرے تھے۔ حتیٰ کہ صوفوں کے اوپر بسکٹس کا چور اور بھی مشن سے بکھرا ہوا تھا۔ اگر لائن میں بیٹھ کر بیٹھ پوجا کی گئی تھی تو پھر جھوٹے برتن اور چٹکے سینے میں کٹنا نام لگ جاتا تھا۔ رات کو ایک اپنے مخصوص ٹائم یعنی ساڑھے گیارہ بجے گھر آیا تو میں نے کالی ناگوار سے اپنے بھرے دل کو خالی کرنا چاہا تھا۔

”وہ اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھتیں، مواس لیے۔“ وہ فریش ہو کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ ایک کو اور مجھے بھی لی دی سے دلچسپی نہیں تھی۔ سو ہمارے کمرے کا لیوی خاموش رہتا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں ریاں لگتی۔ ”جس گھر میں قیام ہو چاہے وہ کرانے کا ہی کیوں نہ ہو اسے اپنا سمجھ کر اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کرنا چاہیے۔“

”یہ تو تمہاری سوچ ہے۔“ اس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

”مگر انہیں بھی ایسا سوچنا چاہیے۔ رانی ایک دفعہ صفائی کر جاتی ہے۔ پورا دن ہمیں خود ہی گھر کو صاف رکھنا ہوتا ہے۔ اگر گندگی یا پھیلاؤ انہیں سمیٹیں گے تو اگلے دن تک بھلا کیا حالت ہوتی ہوگی۔ بچے اس گندگی میں کھیلنے لگتے ہیں۔ فرش سے گندنی چیزیں اٹھا کر کھاتے ہیں۔ اسی لیے آئے دن ڈاکٹروں کے پاس بھاگی رہتی ہیں۔“ میں نے کلس کر کہا تھا۔ اپنا سچا سچا سیکے والا گھر دیکھ کر آئی تھی سو اس لیے طبیعت خاصی اوب رہی تھی کیونکہ میرے پیچھے اس کمرے کی صفائی تک نہیں کروائی گئی تھی۔ فریج پر گرد کی ایک تہ چمک رہی تھی۔

”اب بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ عون اور فائزہ کو چاہیے ان چیزوں کی طرف دھیان دیں۔ بیویوں سے کہیں کچھ اور نہ سہی، کم از کم کچن کی طرف توجہ خود دے لیا کریں۔ مینے پھر کاراشن وں دن میں اڑا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب گھر کی خواتین توجہ نہیں دیں گی تو ہر چیز کو ضائع کر دیا جائے گا مگر یہاں شروع سے ہی ایسے حالات ہیں۔ واوی اور ملا سیدھی سادی خواتین تھیں۔ پکانا، کھانا آتا نہیں تھا۔ شروع سے ہی نجمہ بی سنبھالتی ہیں۔ نیا اور سی نے یہی کچھ دیکھا ہے۔ سو انہیں جان مارنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ خیر چھوٹو، ان باتوں کو بے تاد، گھروالے کیسے ہیں؟ سفر میں پر اہم تو نہیں ہوئی؟“

ایک نے بات تبدیل دی تھی۔ جس بات کا کوئی نتیجہ نہیں لکنا تھا۔ اس پر بھلا بحث میں وقت کیوں ضائع کیا جاتا۔ اب وہ میرا حال احوال پوچھ رہا تھا۔ وہ میرے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بہت دھیان سے سنتا تھا۔ اگرچہ چھوڑ کر تو مجھے ایک ہی آیا تھا تاہم واپس میں ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ ایک ہفتہ تک

رہنا تو نہیں تھا مگر چونکہ عموہ بھائی فیملی سمیت کراچی سے آگئے تھے سو ان کے بچوں کے لیے میں وہاں رک گئی تھی۔ حالانکہ میرا ابھی مزید رہنے کا ارادہ تھا مگر ایک نے مجھے ایک دن بھی اوپر نہیں رہنے دیا تھا۔ ”مسئلہ تو کوئی نہیں تھا مگر میں نے آپ کو بہت مس کیا۔“ میں ہونٹوں میں مسکان دبا کر مڑے سے بولی۔ اگرچہ میں نے سچائی کو ظاہر کیا تھا مگر ایک میرے اس بچ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

”سراسر جھوٹ۔ اگر مس کرنا ہی تھا تو میرے ساتھ ہی واپس آ جاتیں۔“

”پورے دو ماہ بعد گئی ہوں جناب، صرف ایک ہفتہ کے لیے۔“

”اور میرے لیے یہ ہفتہ پورے دو ماہ کے برابر تھا۔ دن گزر رہا تھا نہ رات۔“ وہ میری طرف دیکھ کر دلش سے مسکرایا۔

”سراسر جھوٹ، اگر ایسی بات تھی تو آ جاتے نا۔“

میں ملاؤ سے بولی۔

”بس جی کیا کریں۔ مجبوری تھی۔“ ایک نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”کیسی مجبوری؟“ میں نے آنکھیں دکھائیں۔

”میری جان! کاروبار سلطنت کی مجبوریوں کیا کم ہیں۔ ذرا ادھر ادھر ہو جاؤں تو لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے بولا تھا۔

”کیوں بھلا فائزہ اور عون وغیرہ ہوتے تو ہیں۔“

”مگر وہ اتنی توجہ نہیں دیتے۔ لاکھوں کا نقصان ان کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میری غیر موجودگی میں کچھ اونچ نیچ ہو جائے تو وہ لوگ سنبھل نہیں سکتے۔ ابھی نا سمجھ ہیں۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائیں گے۔“

وہ حد درجہ سنجیدہ تھا اور خاموش ہی رہتا تھا۔ کم بولتا تھا مگر بہت اچھا بولتا۔ زیادہ تر میں ہی اسے بولنے پر اکساتی تھی۔ خود سے کبھی بھی گفتگو کا آغاز نہیں کرتا تھا۔ ہاں، محبت لٹانے کے معاملے میں وہ کنبوس ہرگز نہیں تھا اور اظہار کے معاملے میں تو بالکل نہیں۔ اپنے مخصوص لمبے میں وہ ہمایا ہوتا وہ سیدھا دل

میں اتر جاتا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ وہ میرے بازو پر ہاتھ رکھے بڑی نرم گرم جذبے لٹانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے علاوہ کچھ اور سوچ سکتی ہوں۔“ میں اس کی محبت لٹانی نظر سے نظر اٹائی تھی۔

”ہیش ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ اس کا کبیر لہجہ یوں ہی دل دھڑکا دیتا تھا۔

”بھلا کیسے؟“ میں نے بوجھل پلکوں کو بشکل اٹھا کر پوچھا۔

”تمہاری سوچوں میں، خیالوں میں، باتوں میں صرف میں ہوں، میرے علاوہ کوئی اور نہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔

”میرا دل پکا ایمان دار ہے۔ بے ایمانی نہیں کرتا۔“

”اور میں اسے بے ایمانی کرنے بھی نہیں دوں گا۔“

وہ میرے کان کے قریب گلگٹا تھا۔ ایک کی قربت کا خمار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا میرے دل میں اتر آیا تھا اور میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کی آواز اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔

دن کچھ اور آگے سر کے تو گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے کچن ہی نہیں بلکہ پورے گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا اور میرے اس عمل سے کسی اور کو تو

نہیں البتہ نجمہ بی کو خاصا دچکا پہنچا تھا۔ انہوں نے

وے دے لفظوں میں مجھے سمجھانا بھی چاہا تھا۔ ان کی ہر

ممکن کوشش تھی کہ میں امور خانہ داری سے دور رہی رہوں مگر میں نے ان کی کسی کوشش کو کامیاب نہیں

ہونے دیا تھا۔

میرے کچن سنبھالنے ہی ہر چیز میں ترتیب اور نفاست نظر آنے لگی تھی اور خوش رنگ کھانے دیکھ کر

تو کیف کے علاوہ عون اور فائز بھی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

اس گھر کے افراد کا ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ سب لوگ

ایک جگہ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ رات کو مرد

حضرات گھر میں ہوتے تھے مگر پھر بھی کھانا اپنے اپنے

کمروں میں ہی کھایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود تقریباً

سب ہی ہر روز نئی دشن کو دیکھ کر نہ صرف چونکے

تھے بلکہ ”فرا“ ”فرا“ سب ہی نے میرے ہاتھ کے

ڈانٹنے کو سراہا بھی تھا۔ ان میں نیا اور کسی بھی شامل

تھیں۔

”سچی بھائی! آپ تو بڑا اچھا کھانا بنا لیتی ہیں۔ کیا

باقاعدہ کورس کیا ہے۔“ یہی تو کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آ

رہی تھی۔

”نہیں“ میں نے اپنی بڑی ممتا سے سیکھا ہے۔“

میں بھلا جھوٹ کیوں بولتی۔

”آپ میں بہت سلیقہ ہے بھائی!“ اب کے نیا

نے کہا۔ ایک بات تو اچھی تھی کہ یہ دونوں میری

تعریف سے نہ جلتی تھیں اور نہ ہی سراپنے میں بخل

سے کام لیتی تھیں۔ اور پھر میں کون سا کسی سے تعریفی

سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کام کرتی تھی۔ یہ

میرا گھر تھا اور ایک کے حوالے سے اس گھر کا ہر کام

میرے لیے اہم تھا اور ہر فراہم ترین۔

چکن کی حالت بہتر کرنے کے بعد میں نے وادی کا

کمر اور کھا تھا۔ وہ اس گھر کی بزرگ، ہستی تھیں مگر ان

کی اہمیت اور حالت کسی نوٹے پھونے کا کارہ سالان

سے بڑھ کر نہیں تھی۔

سب سے پہلے میں نے ان کے لیے آئرن راڈ کا

سنگل بیڈ منگوایا جس کا گدا انتہائی نرم اور آرام دہ

تھا۔ اس پرانے قدم پلنگ کو اٹھا کر اسٹور روم میں

رکھوا دیا تھا۔ وادی کے کمرے کے صدیوں پرانے

بروے میل کچیل اور دھول مٹی کے باعث اپنی اصل

رنگت کھو چکے تھے۔ انہیں اتروا کر کوڑے دان میں

پھینکوا اور نئے بروے دیے تھے۔ چھین ”دوا“ زے

اور کھڑکیں جھاڑیں۔ فرش کو سرف ڈال کر گرگڑ

کے رانی سے دھلوا یا۔ کمرے میں اتنے سالوں سے

رجی بو کا دھیرے دھیرے ہی سہی خاتمہ ضرور ہو گیا

تھا۔

وادی کے سارے کپڑے استری کروا کر الماری

میں ترتیب سے رکھے تھے۔ ایک سفید رنگ کا سوٹ

انہیں نسلہ دھلا کر پہنا یا۔

اور جب دوبارہ انہیں کمرے میں لایا گیا تو ان کی

بوڑھی آنکھیں روشن روشن منظر دیکھ کر نمی کے

باعث چپکنے لگیں۔ وہ بول نہیں سکتی تھیں مگر اشاروں

سے انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ بہت خوش محسوس کر

رہی ہیں۔ انہوں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب

بلوایا اور میرے ہاتھوں اور سر کو چوما تھا۔ اس محبت کے

اظہار پر میری آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ میں نے

وادی کے سفید جھاگ جیسے بالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”وادی! اس میز پر کیلے رکھے ہیں۔ آؤ بھی موجود

ہیں۔ یہ پھل نرم ہے۔ آپ آسانی سے کھا لیں گی۔

بوا مل پانی بھی پیاس ہی رکھا ہے۔ آپ کو کسی بھی چیز کی

ضرورت ہوئی تو یہ کھنی بجائیے گا۔ رانی ”فرا“ آجائے

گی۔ میں ابھی آپ کے لیے مزید اس ماسوپ بنا کر لاتی

ہوں۔“

”ہاں، ہاں ہاں۔“ وادی گویا میری بات سمجھ چکی

تھیں، سو اسی لیے اثبات میں سر ہلانے لگیں۔ میں

نے ایک سے کہہ کر ایک نرس کا بندوبست بھی کروا

لیا تھا۔ یہ نرس بہت اچھی تھی۔ یہ وہ عورت تھی۔

وادی کی جی جان سے دیکھ بھل کرنے لگی۔ انہیں

نسلانی، دھلائی۔ روزانہ نیا سوٹ پہنانی احتیاط سے

کھانا کھلاتی تھی۔ وقت پر دوا دیتی۔

وادی کو خوش باش اور بہتر حالت میں دیکھ کر مجھے

لگتا تھا گویا میرے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔ اسی

طرح ملکا کا کمر ابھی اتہری کا شکار تھا مگر پھر میرے ہاتھوں

نے اس کمرے کو بھی سنوار کر ہی چھوڑا تھا۔ لمبائے

بھی مجھے اپنی من مانی کرنے دی تھی۔ وادی کی طرح

انہوں نے بھی خاموشی سے مجھے سراہا ضرور تھا اور

میرے سر پر پہلے دن کی طرح ہاتھ رکھ کر خاموش سی دعا

دی اور پھر صبح کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

گھر کا اندرونی نظام میرے ہاتھ میں کیا آیا؟ نہ صرف

گھر میں سلیقہ نظر آنے لگا بلکہ کچن کے اخراجات بھی

نہ ہونے کے برابر ہو گئے تھے۔ راشن ختم ہونے کا نام

نہیں لیتا تھا۔ اور جو پیسے بھی مختلف بلز اور راشن کے

لیے ایک ہوتا تھا۔ ان میں سے بھی کافی بچ جاتے تھے۔

حالانکہ پہلے پبل مینے میں دو دو دفعہ راشن آتا تھا۔

جوں ہی میں نے یہ بات نجمہ بی سے کی تو وہ ٹھنڈے

لہجے میں بولیں۔

”بوا! میں بھلا کیا کروں۔ کیف بوا! راشن اور بل

وغیرہ کے پیسے مجھ سے لے جاتے تھے۔ مگر نہ بل ادا

ہوتا تھا اور نہ ہی راشن آتا۔ مجبوراً ”میں پھر ایک سے

پیسے مانگنے کھڑی ہو جاتی تھی۔“ نجمہ بی جی تو کہہ رہی

تھیں۔ انہیں بھلا اس برہا پے میں بھوت بولنے کی

کیا ضرورت تھی۔

”اگر کیف کو پیسے چاہیے ہوں تو ایک سے مانگے۔

گھر کے اخراجات میں سے پیسے کیوں لیتا ہے۔“ میں

البتہ کر رہ گئی۔

”ان ہی کے پیسے ہیں جی، جہاں سے مرضی لیں۔

ہم تو اس معاملے میں بول نہیں سکتے۔“ وہ ہاتھ جھاڑ کر

کھڑی ہو گئی تھیں۔

”بوا! میں ذرا آرام کروں۔ اللہ تمہیں سکھ دے“

جب سے آئی ہو۔ میری بوڑھی بڈیوں کی بچت ہو گئی

ہے۔“ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تمام زندگی

ان کا اسی گھر میں قیام رہا تھا۔ آگے پیچھے کوئی تھا نہیں

موایک کے ابا تو مرنے لگے تھے۔ یہ

ان کی خاندانی ملازمہ تھیں۔

میں اٹھ کر کچن میں آگئی۔ رات کے کھانے کی

تیاری کرنا تھی مگر ممائی فون کل نے اپنی طرف متوجہ

کر لیا تھا۔ فون بند کر کے ابھی کچن میں قدم رکھا ہی تھا

’جب کیف آمد می طوفان کی طرح چلا آیا۔

”نجمہ بی کہاں ہیں؟“ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا تھا۔

”وہ آرام کر رہی ہیں۔“ میں چکن کا پیکٹ کھول کر

گوشت کا حساب لگا رہی تھی کہ ایک پیکٹ سے رات

کے لیے سالن بن سکے گا۔

”اور تم کیا کرنے لگی ہو؟“

”کھانے کی تیاری۔“ میں نے ایک اور بیکٹ فریزر میں سے نکالتے ہوئے بتایا۔

”یہ کالم جھلی کے سرورپی رہنے دیتا تھا۔“

”کیوں؟ میں نہیں کر سکتی کیا؟“ میں نے چونک کر چچھا۔

”بہت اچھا کرتی ہو۔ مگر خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے اور ایک نے ہنی مون کے لیے نہیں جانا۔“ وہ کچھ کہتے کہتے بات پلٹ گیا تھا۔

”نہیں بھلا ہنی مون کے لیے جانا ضروری ہے؟“

”بہت ضروری ہے۔ تم لوگوں کو کہیں کھوٹنے پھرنے ضرور جانا چاہیے۔“ وہ اسٹول سمجھ کر بیٹھ گیا تھا۔

یعنی اس کا ابھی مزید گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔

”تمہیں ایک سے بات کرنا چاہیے تھی۔“ وہ مجھے آکھا رہا تھا۔

”دیکھو گی۔ ایک فارغ ہوں گے تب ہی تو کہیں جائیں گے نا۔“ میں نے نوکری میں سے پیاز نکال کر چھینا شروع کر دی تھی۔

”اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرو گی تو پھر یوں ہی بیٹھی رہ جاؤ گی۔ وہ نہیں فارغ ہونے والا ہے۔ کاروبار یہ

روپیہ پیسہ اسے جان سے زیادہ پیارا ہے۔ اوہ اوہ اوہ ہونے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اب یہ

تمہاری محبت پر منحصر ہے کہ تم اپنی بات اس سے منوا سکتی ہو یا نہیں۔“ وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”اگر تو تمہاری محبت کا پلڑا بھاری ہوا، پھر تو سمجھو تم کامیاب ہو گئیں۔“

”مجھے ایک کی محبت پر شک نہیں ہے۔ اگر وہ فارغ ہوئے تو ضرور میری بات مان لیں گے مگر۔ مجھے

ان کی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ سو اس لیے میں اپنی وجہ سے ایک کو پریشان نہیں کر سکتی۔“ میرا انداز وہ

ٹوک قسم کا خاصا اور روکھا تھا۔ تب ہی تو کیف کالجہ بھی بدل گیا اور گفتگو کا انداز بھی۔

”اتنی مشرقیت کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔

وہ ویسے ہی تمہارے دام میں پھنس چکا ہے۔“

”کیف؟“ میں اس کے الفاظ سن کر دونگ رہ گئی تھی۔

”تم کس قسم کی لینکونج پوز کر رہے ہو؟“

”میں نے کچھ غلط کیا؟“ وہ فوراً ”معموم بن گیا تھا۔“

”میرے بھائی کو محبت کے دام میں الجھا تو لیا ہے۔ ویسے میں چاہتا بھی یہی تھا۔“

”کیف؟“ اذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ میں اس وقت تمہاری بڑی بھابھی ہوں۔ میرا اور تمہارا رشتہ بدل چکا ہے۔“

”میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔“

”ہماری دوستی کا رشتہ تو ابھی تک قائم دائم ہے۔ دوست ہونے کے ناتے تم میرا ساتھ دو گی نا۔“ وہ اتنے

کھردرے لہجے میں بولا تھا کہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔

”گوں کی دوستی؟“

”وہ ہی جو میرے تمہارے درمیان تھی۔“ وہ چبا چبا کر بولا۔

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ میں اس کے بدلے انداز دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ سو مذاق کے رنگ میں بات نہیں

کر رہا تھا۔ اس کا لہجہ گہرا طنزیہ، کاٹ دار قسم کا تھا۔

میری بڑھ ک ہڈی سننا اٹھی۔

”اب کیا ہے نا؟“ دانش مندانہ سوال۔ میں بھلا کیا

چاہتا ہوں۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا تھا اور پھر بولنے لگا۔

اور میرا رنگ لمحہ بہ لمحہ نفی ہوتا جا رہا تھا۔



نیا اور سی بھی ان دنوں اپنے حجرے سے باہر نکل آئی تھیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دونوں نے

گھریلو امور میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اگر میں

کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی تو سی یا نیا فوراً

ساتھ دینے کے لیے آجاتی تھیں۔ اسی طرح اگر میں

سالن پکارتی ہوتی تو نیا برتن دھونے کڑی ہو جاتی۔ آنا

گو نہ دیتی۔ حتیٰ کہ روٹی بھی پکادیتی۔ مجھ کی گویا

چھٹی ہوئی تھی۔ اب وہ صرف سودا سلف لا کر دیتی

تھیں۔

دوسری طرف سی کپڑے استری کرتی۔ مردوں کے

الگ رکھتی۔ خواتین کے الگ رکھے جاتے۔ ان

دونوں کی شخصیت میں در آنے والی تبدیلیوں نے فائر

اور عوں کو بھی چونکا دیا تھا اور وہ ان دونوں کے سدھر

جانے کا تمام تر کڑٹ مجھے دیتے تھے۔

ادھر کیف کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ سب گھر

والے اس طرح سے میرے گویہ ہو جائیں گے۔ لما

اور دادی کچھ کہتی تو نہیں تھیں مگر ان کی آنکھوں میں

موجود شکر گزاری کے رنگ میری نظروں سے اوجھل

نہیں تھے۔

نیا اور سی فیشن سے لے کر اسکن کی کیئر تک ہر

مشورہ مجھ سے لینے کے لیے بھاگی بھاگی آتی تھیں۔

ان کے خیال میں میرے پاس معلومات کا بہت بڑا

خزینہ موجود ہے اور میں بڑے شہر سے آئی تھی سو مجھے

پرفیشن کے بارے میں علم تھا۔ یہ تو نیا اور سی کی ساواگی

تھی حالانکہ مجھے بدلے فیشن کا کچھ پتا نہیں تھا مگر میں

غانی سے مفید مشورے لے کر انہیں معلومات فراہم

کرتی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں میرے اور

بھی قریب آگئی تھیں۔

ان کا زیادہ وقت اب میرے ساتھ گزرتا تھا۔ مل

جل کر بحث پٹ کام بھی ہو جاتے تھے۔ گھر بھی صاف

ستھرا ہو جاتا تھا اور پھر کافی دیر گپ شپ بھی چلتی رہتی۔

وہ دونوں صرف سونے کے لیے اپنے کمرے میں جاتی

تھیں۔ زیادہ تر لاؤنچ میں ہی بیٹھی رہتیں۔

اس دن بھی سی اپنی بچی کا مجھ سے پوچھ پوچھ کر

فراک سی رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی

تھی۔ ایک دم میں نے میگزین ہاتھ سے رکھ کر کچھ

سوچنے ہوئے سی سے پوچھا۔

”بہت دن ہوئے کیف گھر نہیں آیا۔“

”وہ گھر کہاں آتا ہے۔ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا

ہے۔“ وہ احتیاط سے سوئی دھاگہ ڈالتے ہوئے بولی۔

”مگر کیوں؟“ میں حیران ہوئی۔ جب سے میں آئی

تھی۔ کیف کا یہی معمول دیکھ رہی تھی۔ تاہم میں نے

ایک سے بھی نہیں پوچھا تھا کہ کیف کہاں جاتا ہے۔

”پتا نہیں۔“ صاف لگ رہا تھا وہ ٹانے کی کوشش

میں ہے۔

”کیوں پتا نہیں؟“ کو مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔“

میں نے جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لیا تھا اور میری

ناراضی کے خیال سے وہ فوراً ”بول اٹھی۔“

”نہیں بھابھی! ایسی بات نہیں۔“ وہ کچھ گھبرا گئی

تھی۔ ”دراصل پہلے ایک بھائی اور کیف کی کبھی بی

نہیں تھی۔ کیف ہر وقت ایک بھائی سے جھگڑتا رہتا

تھا اور یہ جھگڑا شدت اختیار کر جاتا تھا۔ بات ہاتھ پائی

تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک دفعہ کیف نے غصے میں ایک

بھائی کا سر پھاڑ دیا تھا۔ ایک دفعہ گولی بھی چلا دی تھی۔

مگر یہ کافی سال پرانی بات ہے۔ اب تو اس نے ایک

بھائی سے صلح کر لی ہے۔ پہلے سے کافی بدل گیا ہے،

ورنہ تو ہر وقت خون سوار رہتا تھا اس کے سر پر۔ پھر

جب اس نے بتایا کہ وہ ایک بھائی کے لیے لڑکی پسند کر

چکا ہے۔ تو ہم سب حیران رہ گئے اور زیادہ حیرانی اس

وقت ہوئی تھی جب ایک بھائی نے اس کی پسند کی لڑکی

سے شادی بھی کر لی۔

ان دنوں ہم لوگ ایک بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھ

رہے تھے۔ عوں کا خیال تھا۔ ایک بھائی کے ساتھ

مغل مناسب رہے گی مگر کیف کو گل پسند نہیں تھی اور

یہ ہماری اور ایک بھائی کی خوش نصیبی تھی کہ آپ

ہمیں مل گئیں۔ دراصل پہلے پہل ہمارے ذہن میں

تھا کہ آپ بہت مغرور اور تنگ چڑھی ہوں گی۔ اسی

لیے میں اور نیا آپ سے ڈراؤ اور دور ہی تھیں مگر آپ تو

ہماری سوچوں کے بالکل برعکس نکلی ہیں۔“

وہ ساواگی بھرے لہجے میں بتاتی چلی گئی تھی۔

”کیف کا جھگڑا ایک کے ساتھ کس بات پر تھا؟“

میں نے سوچوں کے کھنور سے نکل کر پوچھا۔

”یہ تو مجھے نہیں پتا۔ میرے آنے سے پہلے کی بات

ہے۔“

”نیا کو بتاؤ گا؟“ میں نے سی سے پوچھا۔

”نہیں، میرے خیال میں مجھ ہی جانتی ہیں۔“

”اب تو ان کے درمیان کوئی لڑائی نہیں؟“ میں اپنی تسلی کے لیے پوچھ رہی تھی۔
”نہیں بالکل بھی نہیں۔ ایک بھائی تو مزاجاً بھی اور دل کے بھی بہت اچھے ہیں۔ کیف جذباتی اور غصہ دور ہے۔ تاہم ایک بھائی نے بھی بات نہیں بڑھادی“

وہ فراک سی چکی تھی۔ اب سلمان سمیٹ رہی تھی اور میں گری سوچوں میں ڈوب ابھر رہی تھی۔ دراصل میرا ذہن بری طرح سے الجھ چکا تھا۔
”آخر کیف نے مجھے کس مقصد کے لیے استعمال کیا ہے؟ مجھے ایک کے لیے پسند کرنا۔ حق میں میری اتنی بھاری جائیداد لکھوانا۔“ میرا ذہن ایک نقطے پر آکر ٹھہر چکا تھا۔ ”بہر حال جو بھی ہے۔ کیف تو اس کے اپنے گھر والوں سے لے کر ایک تک سب کو دھوکا دے سکتا تھا مگر مجھے نہیں۔ میں یعنی ساجیہ مراد اس کے جال میں کبھی نہیں پھنس سکتی اور میرا یہ خود سے عہد تھا کہ اس ساری پلاننگ کی وجہ آخر جان کر ہی رہوں گی۔“ میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور پھر مطمئن ہو گئی۔

یہ اس دن کی بات ہے جب ایک کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا تھا اور ٹھیک اسی شب کیف چلا آیا۔ اس کے انداز آج کافی بدلے ہوئے لگ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی فیصلہ کر کے آیا ہے۔ میں اس وقت چکن میں تھی اور وہ میرے پیچھے چکن میں ہی چلا آیا۔
”مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ میری چھٹی حس نے فوراً مجھے چونکا دیا۔

”کون سی بات؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ اس کے دھونس بھرے انداز نے مجھے بہت غصہ دلایا تھا مگر میں پھر بھی ضبط کر گئی۔
”کہاں؟“

”بیٹھک میں۔۔۔ مجھے تم سے تنہائی میں بات کرنا ہے۔“

”جو کہنا ہے۔ یہیں کہہ دو۔“ میں پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا تھا۔ پھر بڑے پراسرار انداز میں بولا۔
”میرے ساتھ ایک ڈبل کرو۔“
”کیسی ڈبل؟“ اب تمہیں میں سچ بچ ٹھنک گئی تھی۔ بات معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ میرا دل خوف کے مارے سکنے لگا۔

”یہ گھر تمہارے نام ہو چکا ہے اور ایک کی دو فرنیچر بھی۔ تم ان کے کاغذات قانونی طور پر میرے نام کر دو۔“ اس نے گویا بڑے اطمینان سے آگ پر پڑول کے چھینے پھینکے تھے۔
”کیا مطلب؟“ میں چیخ اٹھی۔

”جلاؤ مت“ میری بات آرام سے سنو۔ میں نے یہ تمام کوششیں اسی وجہ سے کی تھیں۔ مجھے ایک کا اور تمہارا اعتماد جیتنا تھا اور پھر اپنا مقصد پورا کرنا تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ یو سا کے ذریعے اپنے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں مگر پھر اپنی زندگی کی پہلی اور بڑی خوشی کو کھودینے کے خوف نے مجھے تم تک پہنچا دیا۔ میں یو سا کو ایک کے نکاح میں دے کر کوئی رسک نہیں

لے سکتا تھا۔ حالانکہ یو سا کے ذریعے ایک کی ساری برائی میں مجھے مل سکتی تھی۔ اب تو صرف اس گھر کی اور دو فرنیچر کی بات ہے۔ بہر حال تم مجھے تمام کاغذات دے دو۔ علاوہ اس مناکج کی ذمہ داری تم ہی پر ہوگی۔ میں تمہارے ارد گرد ایک جال بن دوں گا۔ تم اس جال سے نکل نہیں پاؤ گی۔“

وہ گویا زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور میرے قدموں کے نیچے سے زمین دھیرے دھیرے سرسکنے لگی تھی۔

”تم دھوکے باز ہو کیف! تم نے مجھے ہی نہیں مجھے بھائی کو بھی دھوکا دیا ہے۔ جس کے ساتھ تمہارا خون کا تعلق ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہاری گندی ذہنیت پر“
لاج پُر کمینگی دکھانے پر۔“ میں گویا غصے کے عالم میں پھٹ پڑی۔

”کچھ بھی کہہ لو۔ کاغذات تو تمہیں دینے ہی پڑیں گے۔“ اس نے گویا آنکھیں ہاتھ پر رکھ لی تھیں۔
”اور اگر نہ دوں تو؟“

”تو پھر اپنی تنہائی کے لیے تیار ہو جانا۔ میں ایک کو صاف لفظوں میں بتا دوں گا کہ تم میری محبت میں گرفتار تھیں اور میرے مجبور کرنے پر تم ایک سے نکاح کرنے پر تیار ہوئی تھیں تاکہ ایک کی دولت ہم دونوں ہتھالیں۔ تمہارے پاس موجود کاغذات تمہاری لالچ کے گواہ ہیں۔ ایک کو مزید یقین دلانے کے لیے میں تمہاری اور اپنی دوستی کا قصہ بھی سنا دوں گا۔ ایک دو گواہ بھی پیش ہو جائیں گے۔ پھر تم کیا کر سکو گی؟“
وہ گویا استہزائیہ مسکرا رہا تھا۔ میری بے وقوفی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس نے مجھے ہی نہیں ایک کے ساتھ بھی دھوکا دیا تھا اور نجانے اس نے مزید کیا کچھ کرنا تھا۔ میرا دل خوف کے مارے پھر پھرا رہا تھا مگر میں نے خود کو کمزور ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”میں تمہیں کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔ دھوکے باز اور فریبی لوگوں کو ان کے انجام تک پہنچا کر رہوں گی۔ تم نے رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں رکھا۔ کیا اتنے

سال کلج اور لونڈو رشی میں یہی سیکھتے رہے ہو؟“
”زیادہ بڑبڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوب سوچ سمجھ لو۔ ورنہ اپنی بربادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ کیف نے گویا آخری وار تنگ دی تھی۔

”تم ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو۔ اگر جائیداد کا کوئی جھگڑا ہے تو ایک سے کہو۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے۔“ میں گویا ٹھنک کر بولی تھی۔

”اگر وہ آرام سے ملتی جاتی تو پھر مجھے اتنی بڑی پلاننگ کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہمارے حق پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور ہمیں اپنے کاروبار میں تنخواہ دار ملازم رکھنا چاہتا ہے۔ مانی فٹ! اس کی چاکری کرتی ہے میری جوتی۔ اسے ہر صورت مجھے برابر کا حصہ دار بنانا ہو گا ورنہ میں ہر حد سے گزر جاؤں گا۔“ وہ دباؤ کر بولا۔

”تم سوری کیف! میں تمہاری بات نہیں مان سکتی۔ مجھے اسے شوہر کا اعتبار اور مان عزیز ہے۔ میں اس کے اعتماد کا خون نہیں کر سکتی۔“ میرے دو ٹوک فیصلہ کن انداز نے اسے بھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔

”میں تمہیں ایک کی زندگی سے نکال پھینکوں گا۔“ وہ غصے کے مارے کف اڑا رہا تھا۔

اور پھر اس نے اپنا کامیاج کر دکھایا۔ وہ مجھے ایک کی زندگی سے باہر نکال چکا تھا۔ یہ اسی مان، اعتبار اور اعتماد کو بچانے کا نتیجہ تھا جو میں اپنی ماں کے گھر واپس آ چکی تھی۔ ایک نے کچھ زیادہ تو نہیں کہا تھا مگر اس کے چند الفاظ نے میرے جسم سے گویا جان تک نکال لی تھی۔

”مجھے دکھ ہوا ہے ساجیہ! میرا دل اس وقت صدمے کے زیر اثر ہے۔ میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتا چاہتا۔ تم ابھی چلی جاؤ ڈرائیو باہر منتظر ہے۔ اگر میں اس صدمے اور دکھ کی کیفیت سے سمجھو تا کر کے سنبھل گیا تو تمہیں لینے آ جاؤں گا۔ ورنہ ہمارے راستے جدا ہیں۔ تم وہ کاغذات بھی ساتھ لے جانا۔ میں تحفہ دے کر واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

دھیما لوجہ، جھکی آنکھیں اور ضبط کی سرخیوں سے سجا چہرہ۔ اس نے نہ وضاحت طلب کی تھی اور نہ ہی مجھے خود سے دور کرنے کی وجہ بتائی۔ مگر میں جان تو چکی تھی کہ کیف کی خود غرضی اور کمینگی رنگ لے آئی ہے۔

میں نے اسی شب سلمان باندھا تھا اور غالی دل لیے ایک کے گھر سے نکل آئی۔ اسے پیچھے واڈی ملا دینا، سہی کو منتظر اور دوتا چھوڑ کر۔ مگر پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد بھلا کیا ہوا؟

”آپ۔۔۔“ میں نے پردے برابر کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گویا پھر ہو گئی تھی۔ ایک عین میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ کب دے پاؤں کرے میں داخل ہوا تھا مجھے

قطعاً ”خبر نہیں ہو سکی۔ اپنی تلخ اور زہریلی سوجھ بھجھ میں گم کھڑکی کے سامنے کھڑے کھڑے میری ٹانگیں گویا شل ہو کر رہ گئی تھیں۔

”ہاں میں۔ کیا تمہیں امید نہیں تھی کہ میں واپس آؤں گا۔“ وہ ہی مخصوص نرم اور دھیما لہجہ۔ میرے دل کی دھڑکنیں اول روز کی طرح بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

”جس طرح مجھے گھر سے نکالا تھا۔ بھلا کوئی امید باقی رہ گئی تھی کیا؟“ نجائے کہاں سے ڈھیروں آنسو میری آنکھوں میں خود بخود اتر آئے تھے۔

”وہ وقت اور لمحے ہی کچھ ایسے تھے۔ ابھی تک اپنے ان الفاظ پر پچھتا رہا ہوں مگر میں بھی بھلا کیا کرتا“ کیف نے کہاں ہی کچھ اس طرح سے سنائی تھی کہ اس کے حرف حرف پر اعتبار آگیا۔ تم سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ یہی میری سب سے بڑی نالائی تھی جس پر ابھی تک پشیمان ہوں۔ جو کچھ وہ بتا رہا تھا، میری طرح کوئی بھی آدمی ان باتوں کے جال میں پھنس سکتا تھا۔“ وہ سر جھکائے دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

”آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ میں ابھی لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جب ایک نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا۔

”پلیز سائی! پہلے میری بات سن لو۔ پھر جو کچھ کہو گی“ میں سننا رہی ہوں گا۔ جو سزا سنو گی۔ مجھے منظور ہو گی۔“ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ گویا کہہ دینے یا نہ کہنے کے درمیان الجھ رہا تھا۔ پھر جب بولا تو آواز میں ہمیشہ والا ٹھہراؤ تھا۔

”بات کہاں سے شروع کروں۔ بہت پہلے سے“ جب میں چودہری قیوم کے آگن میں کھیلنے والا پہلا بچہ تھا۔

پورے آٹھ سال تک میں پہلا اور آخری بچہ ہی رہا تھا۔ اس دوران میرا کوئی اور بھائی اس دنیا میں نہیں آیا۔ میرے دادا کے لیے یہ بات خاص تشویش ناک تھی مگر انہوں نے مجھ پر ہی گویا مبرک کر لیا تھا۔ ان کی مجھ

سے محبت کوئی دھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنی زندگی کی واحد خوشی سمجھتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں گونگے والدین کی اولاد تھا۔ میری ماں اور باپ دونوں قوت گویائی سے محروم تھے۔ میرے ابا، دادا کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی زمینوں اور کارخانے کے اکلوتے وارث۔

ان کے ہاں میں پہلا صحت مند بچہ پیدا ہوا تھا۔ میرے دادا کے لیے میری پیدائش ہفت، اٹھ کی دولت کے برابر تھی۔ انہوں نے جی بھر کے میرے ناز اٹھائے تھے۔ مجھے بے تحاشا محبت سے نوازا تھا۔ میں ان کی محبت کے حصار میں خود کو ہمیشہ محفوظ سمجھتا تھا مگر یہ حصار تب ٹوٹ کر بکھر گیا جب میرے دادا اس دنیا سے چلے گئے مگر جانے سے پہلے وہ اپنی ساری جائیداد میرے نام کر گئے تھے۔ اور ان کے چلے جانے کے بعد یکے بعد دیگرے میرے چار اور بھائی پیدا ہوئے۔ اور پھر ہمارے ابا معمولی سے بخار میں چل بسے۔ تب میں کافی سنبھل چکا تھا اور کچھ وقت کی سختیوں نے مجھے اچھی طرح سے سارے سبق پڑھا دیے تھے۔

میں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ تب کیف بہت تاشک اور نادان تھا اور میری نظر میں تو بالکل بچہ تھا۔ مجھے اپنی ماں اور بھائیوں سے بہت محبت ہے۔ اسی محبت نے مجھ سے بے تحاشا جدوجہد کروائی۔ میں نے اپنے قوت بازو پر اپنی محنت اور جدوجہد سے اپنا گھر بنایا تھا۔ چار فرپانز خریدیں۔ ایک دم سے سارا کچھ نہیں ہو گیا تھا۔ بے تحاشا محنت اور قربانیوں کے بعد میں اپنا ایک نام بنایا تھا۔

تب کیف بڑھنے کے لیے ہاسٹل میں مقیم تھا اور ما کی کسی کزن کے گھر بھی اس کا آنا جانا کرتا تھا۔ انہی کی بیٹی یو ساسہ وہ شادی کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس بات سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ مگر ہوا کچھ یوں کہ ہماری رشتے کی اس خالہ نے یعنی یو ساسی ماں نے میرے خلاف کیف کے دل میں زہر بھرتا شروع کر دیا تھا۔

وہ چاہتی تھیں کہ کیف اپنے حصے کی جائیداد لے کر ان کے پاس آجائے اور جب میں نے ایمان داری کے ساتھ قانونی طور پر اپنے چاروں بھائیوں کو دادا کی جائیداد کا حصہ دار بنایا تو ہم سب کے حصے میں تھوڑی تھوڑی سی برابری آئی۔ یہی بات ہماری خالہ کو بھرپور کائی تھی۔ ان کی نظر میرے کاروبار پر بھی اور وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنے بزنس میں سے بھی کیف کو حصہ دوں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا تھا۔ بعد میں کیف مجھ سے بدگمان ہو گیا۔ میرے ساتھ جھگڑا رہا۔ بات خون خرابے تک آئی تھی۔ میں کیف کو حصہ دار بنانا بھی لیتا اگر بیچ میں خالہ اور ان کی بیٹی نہ ہوتی۔

یہ مسئلہ ضد اور انا کا بن گیا تھا۔ میری اور کیف کی ناراضی چل رہی تھی۔ ایک دن وہ خود میرے پاس چلا آیا۔ اپنی گزشتہ غلطیوں کی معافی مانگتا رہا تھا میں نے بھی کھلے دل سے اسے معاف بھی کر دیا۔ ہمارے پہلے کی طرح تعلقات بحال ہو گئے تھے۔ مجھے نہیں خبر تھی کہ یہ سب ایک سازش اور منصوبے کی کڑی ہے۔

پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ وہ پھوپھو کے بڑوس میں قیام پذیر فیملی سے خاصی انڈر اسٹینڈنگ رکھتا ہے اور ان کی بیٹی کو وہ میرے لیے پسند کر چکا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ہمارے اس طرح کے معاملات نمٹاتی۔ فائز اور عون کی شادیوں کے تمام معاملات اسی نے ہی دیکھے تھے۔

اگرچہ فائز اور عون نے لومینج کی تھی۔ دوران تعلیم ہی دونوں پر شادی کا بھوت موار ہو گیا تھا۔ ہر حال جو بھی تھا، احسن طریقے سے ان کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ اما کی ساری ذمہ داریاں کیف نے ہی نبھائیں۔

ادھر کیف نے مجھے جو کچھ تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے لگا تم میرے آئینہ دل کا ایک حصہ ہو۔ میرے دل نے تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا تھا اور میں بغیر دیکھے ہی تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ ہماری ماں ایسے معاملات نہیں دیکھ

سکتی۔ جو کچھ کرنا تھا، کیف نے ہی کرنا تھا اور وہ اپنی پلاننگ کے تحت سب کچھ کرتا رہا اور میں اپنی سادہ دلی میں اس سے ہمیشہ دھوکا کھاتا رہا۔

شادی کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کے لیے جب رقم کم پڑ گئی تو وہ دوبارہ مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کرنے لگا۔ اگر مجھے سمجھتا ہوتا تو میں تب ہی سمجھ جاتا مگر میں نے شک اور بدگمانی کو کبھی دل میں جگہ نہیں دی تھی۔ پھر حق مکر کے طور پر اتنی بھاری جائیداد پر کیف کی ضد اور اصرار۔ میں حیران ضرور ہوا تھا مگر چونکا پھر بھی نہیں۔ میں نا اہستہ گئی میں وہ ہی سب کچھ کرتا رہا۔ جو وہ مجھ سے کروانا چاہتا تھا۔

میرے لیے سب سے بڑا انعام تم تھیں ساجید! ایسا انعام جو مجھے کیف کے توسط سے ملا۔ میں تمہاری سادگی اور معصومیت کا اسیر ہو گیا تھا۔ مجھے تم سے اور تمہارے خالص جذباتوں سے بھرے دل سے محبت ہو گئی تھی۔ تب کیف نے مچوچا کہ بازی الٹی جا رہی ہے اور وہ اس بازی کو اپنے حق میں کرنے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کر گیا یعنی تمہارے ساتھ دویدو گفتگو کر کے ایسی گفتگو جو کسی نے من و عن سن لی تھی اور پھر مجھے بھی سنائی۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگ اپنے زرخیز دماغ کو لوگوں کے گھر اور دل اجاڑنے کے لیے کیسے استعمال کر لیتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ میرے دل میں شک کی آگ جلا کر خود وہ اپنے دل کو آباد کرنے گیا تھا مگر ہماری ملاچی اور خود غرض خالہ نے کل رات یو ساسا کو ایک کروڑ پتی سیٹھ سے بیاہ دیا اور کیف قیوم کے دل پر گویا شام غریباں اتر آئی۔ اس صدمے میں وہ بانیگ سے ٹکرا کر اپنی ٹانگ ٹڑوا بیٹھا۔ ادھر آئے میں اسی لیے ویر ہو گئی تھی کہ مجھے اس کے پیچھے ہسپتال جانا پڑا۔

دیکھو ساسی! انجمن تودہ ہم دونوں کا ہے مگر میں نے اسے تمہاری طرف سے بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا کروں، میری قوت گویائی سے محروم ماں بول نہیں

سکتی، مجھے حکم نہیں دے سکتی۔ مگر اس کی آنکھوں کی التجا کو لوٹا دینا میرے بس میں نہیں ہے اور میری ماں کی خواہش ہے کہ جب میں واپس آؤں تو تم بھی میرے ساتھ ہو۔ کیا تم میری ماں کی خواہش پوری کرو گی؟“ وہ آنکھوں میں اس کے دیے سجائے منتظر کھڑا تھا۔ میری ایک ماں نے اس کے چہرے کو تباہی بخش دینا بھی۔ مگر میں بھی پورے ایک ہفتے کی ناراضی کا حساب لیے بغیر اسے معاف نہیں کر سکتی تھی۔ اگرچہ ایک مجرم نہیں تھا۔ مجرم تو وہ تھا، جولاچ میں اور یوسا کے حصول کی خاطر خون کے رشتوں کو بھوہینے والا تھا۔ اب اس مجرم کو بھلا اور کیا سزا دی جانی تھی۔ بے چارہ دل تڑوانے کے ساتھ ساتھ ٹانگ بھی تڑوا چکا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ پشیمان تھا، شرمندہ تھا۔ سو میں نے سوچا تھا کہ ایک پشیمان کو بھلا اور پشیمان نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔

مگر ایک کوسٹلے کا میں پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔ سو اسی لیے خود ناراضی کا خول چڑھائے بولی۔
”میں آپ کو معاف نہیں کر سکتی ایک! آپ واپس چلے جائیں۔ میں اپنی انسلٹ نہیں بھول سکتی۔ آپ نے بغیر وضاحت لیے مجھے گھر سے کیوں نکالا؟“
”مجھے معاف کر دو ساجی! میں واقعی شرمندہ ہوں۔“ ایک میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر گھبرا اٹھا۔ وہ ہر صورت مجھے منانا چاہتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ایک کو منانا آسانی نہیں تھا اور ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھا کہ مجھے کیسے منائے کہ اچانک وہاڑے سے دروازہ کھلا اور سی اور نیا کمرے میں داخل ہو کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

”ہم آپ کو زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے بھابھی! اللہ کی قسم، آپ کے بغیر پورا گھر ویران ہو گیا ہے۔“
سی اور نیا بھرائی آواز میں کہہ رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں کی بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے ایک کور کھاتوہ معصوم صورت بنا کر لولا۔

”اللہ کی قسم! میرا دل اور کمرابھی ویران ہے۔“
میری نظر ایک کے چہرے سے ہٹ کر ایک اور چہرے سے الجھ گئی تھی۔ یہ چہرہ ماں کا چہرہ تھا مگر میں جانتی تھی کہ یہ خاموش آنکھیں اور اواس چہرہ کیا التجا کر رہا ہے۔ مجھے اس لمحے ٹوٹ کر اس عورت کی خاموشی پر پیار اٹھ گیا تھا۔

کچھ لوگ اس خاموشی کو پراسراریت سمجھتے تھے مگر میں جانتی تھی یہ پراسراریت نہیں۔ اس خاموشی میں ایک کی ماں کا بھرم پوشیدہ ہے۔ آج بھی میرے گھر والے اس حقیقت سے ناواقف تھے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ سفینہ بیگم کیوں خاموش رہتی ہیں اور نہ ہی میں نے کسی کو بتانے کی کوشش کی تھی کہ ماں خاموش کیوں ہیں۔ وہ قوت گو بانی سے محروم ہیں۔

میری سوچتی ہوئی نظر نے اس لمحے ایک مرتبہ پھر ماں کے پاکیزہ چہرے کا طواف کیا تو ان کے چہرے کی التجا میرے دل پر گویا جا لگی۔

”ساجی! چلو نا، میرا گھر اور میرے بچے کا دل سچ بچ تمہارے بغیر ویران ہے۔“

میرے دل کو ایک دم کچھ ہونے لگا تھا اور میں بھاگ کر ماں سے لپٹ گئی۔ بدگمانی کے بادل چمٹ چکے تھے۔ دلوں پر جی رگد صاف ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے گھر والوں اور ایک کے گھر والوں کے چہرے پر چمکتی خوشی کو دل سے محسوس کیا تھا اور گویا کھل کر مسکرا دی۔

کالے، دووے، سرمئی، سیاہ بادلوں کے پیچھے کا منظر۔۔۔ خوب و خور صاف ہو گیا تھا۔ اب ستاروں سے بھرا آسمان میرے سامنے تھا، اور میں نے نکشائوں کی بارات کو اپنے گھر میں اترتے دیکھا اور مسکرائے لگی۔

